عوامی پالیسی

روایتی فقہ سے مختلف، مقاصدی نقطۂ نظر

PUBLIC POLICY

BEYOND TRADITIONAL JURISPRUDENCE

A Maqasid Approach

بسمہ آئی عبدالغفار

IIIT Books-In-Brief Series

عوامی پالیسی

روایتی فکر سے مختلف، مقاصدی نقطۂ نظر

مصنف

بسمہ آئی عبدالغفار

مترجم

ڈاکٹر حفظ الرحمٰن قاسمی

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی ۲۵

© IIIT, 1445 AH / 2024 CE
IIIT, P.O. Box 669, Herndon, VA 20172, USA • www.iiit.org
P.O. Box 126, Richmond, Surrey TW9 2UD, UK • www.iiituk.com

اس کتاب کے حقوق محفوظ ہیں۔قانونی ضوابط اور متعلقہ اجتماعی لائسنس معاہدوں کی دفعات کے تحت اس کتاب کے کسی حصے کو ناشر کی تحریری اجازت کے بغیر دوبارہ شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ISBN: 978-93-80946-51-1

کتاب میں پیش کیے گئے خیالات کا ناشر کے خیالات سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے۔کوئی تیسرا شخص کتاب کو ویب سائٹ یا کسی اور ذریعے سے عام کرتا ہے،تو اس کے مصدرِ اصلی کے مطابق ہونے کی ذمہ داری ناشر کی نہیں ہے۔

عوامی پالیسی: روایتی فقہ سے مختلف، مقاصدی نقطۂ نظر

(اردو)

Awami Policy: Riwayati Fiqh Se Mukhtalif, Maqasidi Nuqta-e-Nazar

بسمہ آئی عبدالغفار

مترجم: ڈاکٹر حفظ الرحمٰن قاسمی

اصل کتاب Public Policy Beyond Traditional Jurisprudence A Maqasid Approach کا ترجمہ

آئی آئی آئی ٹی کی مختصر کتابوں کا سلسلہ

اصل انگریزی کتاب آئی آئی آئی ٹی سے ۲۰۱۸ میں شائع ہوئی۔

ہندستان میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز،نئی دہلی سے پہلے اردو ترجمے کا سالِ اشاعت ۲۰۲۴

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز

162، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

email: ios.newdelhi@gmail.com / www.iosworld.org

تقسیم کار

الاتحاد پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

B-35،نظام الدین (ویسٹ)،نئی دہلی-110013

Tel.: +91-11-41827475, 9315177399

email: alittehad@gmail.com

قیمت: **Rs.50/-**

فہرست

آئی آئی آئی ٹی مختصر کتب کا سلسلہ ۵

پیش لفظ ۷

تمہید ۹

باب اول-اسلام کی عوامی پالیسی: مقصدی نقطۂ نظر ۱۳

باب دوم- مسلمان اور حکم رانی کی الجھنیں ۱۹

باب سوم- مقصدی مطالعات کی تاریخی بنیادیں ۲۵

باب چہارم-ایک جدید شعبۂ علم کے قیام کی مشکلات ۳۱

باب پنجم- حقوق انسانی: حکم رانی کے مقاصد کا لازمی ڈھانچہ ۳۷

باب ششم-اسلام میں حکم رانی اور عوامی پالیسی کی اخلاقیات ۴۱

باب ہفتم-اسلام کی عوامی پالیسی تجدید واصلاح کے ایک عمل کی حیثیت سے ۴۵

❖❖❖

آئی آئی آئی ٹی مختصر کتب کا سلسلہ

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کی مختصر کتابوں کا یہ سلسلہ ادارے کی اہم اشاعتوں کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے، جنھیں خلاصے کی شکل میں اس لیے تحریر کیا گیا ہے کہ قارئین کو اصل کتاب کے اہم مضامین کے بارے میں بنیادی واقفیت ہو جائے۔ مختصر، پڑھنے میں آسان اور وقت کو بچانے والی یہ اجمالی تحریریں دراصل بڑی بڑی کتابوں کے انتہائی موزوں اور احتیاط سے تحریر کردہ خلاصے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتابچے قارئین کو اصل کتاب کے مطالعے پر ابھاریں گے۔

عام طور پر عمدہ حکم رانی سے مراد شہریوں کے لیے مختلف امور کا منصفانہ انتظام ہے، اس کا ایک بنیادی پہلو عوامی پالیسی اور فیصلہ سازی کے عمل میں جمہوریت کا نفاذ ہے۔ اس سلسلے میں مقاصد شریعت کا کیا کردار ہے؟

ہر قسم کی حکومت مفروضات کے ایک مجموعے کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ مقاصد شریعت اس طور پر اہم کردار ادا کرتے ہیں کہ وہ ایک رہ نما کے طور پر کام کرتے ہیں اور حکومتی کام کی اصلاح، بدعنوانی کے خاتمے اور شہریوں کو اعلیٰ ترین منصفانہ خدمات کی فراہمی کے لیے ایک ایسا دائرۂ عمل تیار کرتے ہیں جس کے اندر مفروضات، اہداف اور اعمال طے کیے جا سکتے ہیں۔ چناں چہ عوامی پالیسی کے ساتھ مقاصد شریعت کا ارتباط حدود قائم کرتا ہے، ذمہ داریوں پر زور دیتا ہے، ترجیحات طے کرتا ہے اور بالآخر حکومت کی جانب سے پالیسیوں کے خدوخال کے تعین کی بحث میں خدائی زاویۂ نگاہ کو داخل کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جن عام لوگوں کی زندگیوں کا معیار ہر روز ان فیصلوں کی وجہ سے متاثر ہوتا ہے جن میں ان کی رائے کو کوئی دخل نہیں ہوتا، ان کو ایک جمہوری آواز عطا کرنے کے لیے شوریٰ ایک اہم بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کے ابواب میں اسلام کی عوامی پالیسی میں مطالعاتِ مقاصد کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر باب ایک مخصوص موضوع سے بحث کرتا ہے جو مجموعی طور پر اس شعبۂ علم کا تعارف پیش کرتے ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں پیش کردہ خیالات میں مزید ارتقا کی ضرورت ہے۔ پالیسی اور حکم رانی نہایت پیچیدہ موضوعات ہیں۔کوئی بھی شعبۂ علم تنقیدی اور سرگرم محققین کی ایک جماعت کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا جو لائق بھی ہو اور بنیاد کی تشکیل کے لیے تخلیقی اعمال پیش کرنے کی خواہش بھی رکھتی ہو۔ دنیا بھر کے اسفار نے مصنفہ کو باور کرایا ہے کہ اس سعی کی حمایت کے لیے مقاصد شریعت کے امکانات میں مضبوط اور روز افزوں دل چسپی پائی جاتی ہے۔

بسمہ آئی عبدالغفار کی درج ذیل اصل تصنیف کا مختصر ایڈیشن

PUBLIC POLICY BEYOND TRADITIONAL JURISPRUDENCE:
A MAQASID APPROACH

ISBN hbk: 978-1-56564-376-5

ISBN pbk: 978-1-56564-375-8

2018

پیش لفظ

یورپ کے صنعتی انقلاب نے زندگی کے ہر گوشے کو متأثر کیا۔ اس سے فرد بھی متأثر ہوا اور معاشرہ بھی۔ ایک طرف نئے نئے مسائل سامنے آئے تو دوسری طرف انسانی زندگی مشینی زندگی میں تبدیل ہوگئی۔ عام انسان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں بچا کہ وہ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالے اور پیش آمدہ مسائل پر غور وفکر کرے۔ لیکن اس صورت حال کے نتیجے میں جدید مسائل کے انبار پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ روز بہ روز ایک نیا مسئلہ سر اٹھاتا اور اہل علم کو دعوتِ فکر وتحقیق دیتا رہا۔ الحمدللہ اہل علم نے اپنی ذمے داری کو محسوس کیا۔ نئے مسائل کو فکر اسلامی کے تناظر میں حل کرنے کی شان دار کوششیں کیں اور بڑے اہم موضوعات پر چھوٹی چھوٹی کتابوں کی شکل میں علمی وفکری مواد پیش کیا۔ گویا دریا کو کوزے میں سمو دیا، تاکہ ہر صاحبِ علم کے لیے ان سے استفادہ آسان ہو جائے۔

زیر نظر کتابچہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں عہد حاضر کے ایک سلگتے ہوئے موضوع پر بڑے علمی وفکری انداز میں قلم اٹھایا گیا ہے۔ موضوع کے تمام علمی گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے مصنف نے پوری مضبوطی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کر دیا ہے، تاکہ موضوع کی اہمیت واضح ہو۔ اس کے مختلف گوشے سامنے آئیں اور عصری تناظر میں اس کو فکر وتحقیق کا موضوع بنانے کی راہ ہموار ہو۔

ہمیں امید ہے کہ مختصر کتابوں کا یہ پورا سلسلہ وقت کے بہت سے اہم موضوعات پر علمی وتحقیقی مطالعے کی راہ ہموار کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم

چیئرمین

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی

تمہید

زیرِنظر کتاب سات ابواب کا مجموعہ ہے، جن میں اسلام کی عوامی پالیسی سے متعلق اہم موضوعات کے تحت مقاصد شریعت سے متعلق علمی تحقیقات کے کردار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر دراصل عوامی ذمہ دار یا ذمہ داران کے اس عمل یا بے عملی کی صورتیں ہیں جنھیں وہ کسی عوامی مسئلے یا مشکل کو حل کرنے یا کسی ایسے موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپناتے ہیں جسے (۱) تقوی اور توحید میں مضمر قرآنی اخلاقیات کے ذریعے پرکھا جاتا ہے؛ (۲) جس کی توجیہ مقاصد شریعت کے ذریعے کی جاتی ہے؛ (۳) جس کی رہ نمائی اجتماعی فیصلہ سازی کے عمل یا شورائیت کے ذریعے ہوتی ہے؛ (۴) اور جس کا نتیجہ اصلاح اور فلاح کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ روایتی تشریح کے لحاظ سے مقاصد شریعت کو ایک ایسا اخلاقی ڈھانچہ قرار دیا جاسکتا ہے جو عقیدے، زندگی، دماغ، اولاد، دولت اور ناموس کے تحفظ کو محیط ہو۔ زیرِنظر کتاب کا مقصد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ مقصدی طرزِ فکر اسلام کی عوامی پالیسی کے نظریہ وعمل کا لازمی جزو ہے اور یہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ علما و کارکنان کو اسلام کے بنیادی مآخذ یعنی قرآن وسنت کا مطالعہ کرتے وقت پالیسی اور پالیٹکس کے درمیان لازمی طور پر امتیاز کرنا چاہیے۔ مؤخر الذکر بنیادی مآخذ میں موجود حکم رانی کے عمل اور ٹھوس بنیاد کے اطلاق کے لیے دوررس مضمرات کا حامل ہوسکتا ہے۔

دوسری عوامی پالیسی کے عمل اور مطالعے کی طرح ہی اسلام کی عوامی پالیسی بھی نہ تو فن ہے اور نہ سائنس، بلکہ اس میں دونوں کے عناصر موجود ہیں۔ اس کی فنی حیثیت ان طریقوں کے متبادل کی تشخیص، تیاری اور پیش کش کی صلاحیت میں مضمر ہے جو اس سے سروکار رکھنے والے بہت

سے لوگوں کو ایک مخصوص لائحہ عمل اختیار کرنے پر اکساتا ہے۔ اور یہ اس حد تک ایک سائنس ہے کہ یہ ایک ٹھوس طریقۂ کار پر مبنی ہے جو معاصر پالیسی کی مشکلات کو حل کرنے کے تازہ اور تخلیقی طریقۂ کار کی تلاش کے لیے بنیادی مآخذ کو کھنگالتا ہے۔ ایک فن اور سائنس کی حیثیت سے اسلام کی عوامی پالیسی مقاصد شریعت کے فلسفیانہ ڈھانچے میں پیوست ہے، جو عمل کنندگان اور علما کی اگلی نسلوں کے ذریعے دریافت کردہ علم کی تفہیم، تشریح اور تعمیل کے لیے منزل اور غیر منزل متن کی مربوط اور بامقصد قرأت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

مقاصد شریعت سے متعلق علمی تحقیق اس مقصد کے لیے ایک لازمی کردار پیش کرتی ہے۔ مقاصد شریعت کا علم اسلام کے دیگر زاویہ ہائے نظر، بطور خاص روایتی فقہ سے، اس طرح ممتاز ہوتا ہے کہ یہ مقصدیت، قدر کی بنیادوں اور ترجیحات پر زور دیتا ہے، نیز وہ کثیر شعبہ جاتی مہارت اور کثیر مناہج کو قبول کرتا ہے۔ عصر حاضر کے متعدد معروف علما کے ذریعے اس طرزِ فکر کا احیا چھ نکاتی مساعی کی نمائندگی کرتا ہے: (۱) شریعت کو ان عہدوں سے الگ رکھنا جو رحم دلی، انصاف، مساوات اور فلاح کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کرتے ہیں؛ (۲) اکثر سیکولر اور بعض مسلمانوں کے اس جدید نظریے کا ابطال کہ اسلام ایک دقیانوسی، غیر منصفانہ اور پر تشدد مذہبی نظام ہے؛ (۳) اس بات کی توجیہ تلاش کرنا کہ عمومی سطح پر امت مسلمہ کے معاملات انسانی ناموس کے خدائی حکم کا عکاس کیوں نہیں ہیں؛ (۴) عالم اسلام اور پوری دنیا میں احیائے اسلام کے لیے اس تنگ فقہی نظریے کا متبادل پیش کرنا جو روایتی مکالمے پر حاوی رہا ہے؛ (۵) دیگر شعبوں کے اسکالرز کو اپنے اپنے میدانوں میں اسلامی مطالعات کو شامل کرنے کے لیے کنجی فراہم کرنا؛ اور (۶) متنوع تہذیب و تمدن کی حامل عالمی اسلامی برادری کو متحد کرنے اور دوسروں کے ساتھ مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کے لیے معیارات تجویز کرنا۔

اس کتاب کے ابواب میں چھوٹے مسائل کے بجائے بڑے مسائل پر توجہ دی گئی ہے۔ عوامی پالیسی اور حکم رانی میں مقصدی طرزِ فکر کا اطلاق کیسا لگتا ہے، اس حوالے سے یہ ابواب

مربوط خیالات کا ایک سلسلہ پیش کرتے ہیں، تاکہ ہم صرف عوامی پالیسی کا تعین اور احتساب ہی نہ کریں، بلکہ زیادہ اہم یہ ہے کہ ہم دوسروں کے دعووں کا جائزہ بھی لے سکیں۔ عوامی پالیسی اور اسلام میں اس کے اطلاق کے میدان میں (جس کا مطلب عوامی ذمہ دار یا ذمہ داران کے ذریعے کسی عوامی مسئلے کے حل کے لیے کیا جانے والا عمل یا بے عملی ہے) درحقیقت مسلمانوں کے ذریعے قرآن کو ایک کسوٹی کے طور پر قبول کرنے کا مقدس عہد ہے۔

باب اول

اسلام کی عوامی پالیسی: مقصدی نقطۂ نظر

یہ تعارفی باب اسلامی حکم رانی کے مطالعات پر حاوی فقہی نقطۂ نظر کی حدود، ان حدود کی قدردانی کے طریقوں، مقصدی مطالعات کو درپیش چیلنجز اور مشکلات کے حل کو حکمتوں کے متعلق وضاحت کرتا۔ ہر چند کہ اس ضمن میں کئی بیانیے درست ہو سکتے ہیں، تاہم عالمی پیمانے پر مسلمانوں کے عملی تجربات نیز فقہی طرزِ فکر اور بے جا ماضی پرستی کی وجہ سے ان کو جن نتائج کا سامنا کرنا پڑا ہے، وہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتے ہیں۔ عوامی پالیسی اور حکم رانی کی راہ میں درپیش اسلام کی موجودہ دشواری سے نمٹنے کے لیے مسائل کا جائزہ لے کر حل تجویز کرنے کے جامع تر، بامقصد، متحرک اور پیچیدہ مناہج کے ساتھ فقہی طرزِ فکر کا اضافہ ایک اہم اقدام ہے۔

اسلام کی عوامی پالیسی کے فقہی طرزِ فکر کی تمام حدود میں سب سے بنیادی مسئلہ شوریٰ کی ضرورت کو نظر انداز کرنا یا کم تر سمجھنا ہے، جو اجتماعی فیصلہ سازی کے لیے خدا کی جانب سے وضع کردہ ایک طریقہ ہے۔ اس کو روایتی طور پر ایک نوع کی مشاورت سمجھا گیا ہے جو حاکم پر لازم ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ شوریٰ کا لغوی مفہوم مکھی کے چھتے سے شہد نکالنا ہے، جس سے ذہن اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ فیصلہ سازی کا کوئی بھی عمل اور اس کے نتائج لازمی طور پر واضح اور مفید ہونے چاہییں، یعنی وہ اصلاح کا راستہ ہموار کرے۔ چند فقہا کے اختلاف کے باوجود شوریٰ فرض کی حیثیت رکھتی ہے جس کو قرآن میں اللہ کی طرف جواب دہی اور نماز قائم کرنے کے حکم کے فوراً بعد بیان کیا گیا ہے۔ (قرآن: ۸۳:۲۴)

شوریٰ کا تصور ہمارے سامنے اس بات کی کامل مثال پیش کرتا ہے کہ منزل اور غیر منزل متن

کو کس طرح ساتھ ساتھ پڑھنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کی قرأت ناقص علم اور تضاد کی طرف لے جاتی ہے۔ شہد کی مکھیوں کے حوالے کی وجہ سے شوریٰ کے تصور کو ایک تلمیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ وحی منزل یعنی قرآن کی دو سورتیں سورہ الانبیاء اور الشوریٰ اس اشارے کی اہمیت کو واضح کرنے میں معاون ہیں۔ مقدم الذکر سورہ میں ہمیں انسانی افکار میں تنوع کے باوجود مقصد میں وحدت کی اہمیت کو یاد دلایا گیا ہے۔ مؤخر الذکر میں اس تنوع کے فطری نتیجے بلکہ کامیاب اجتماعی فیصلہ سازی اور پریشانی سے ابھرنے کی انسانی صلاحیت میں ضروری حصے دار کے طور پر لوگوں کے درمیان ناگزیر اختلافات کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

غیر منزل متن کی دریافتوں کو پیش کرنے والا معاصر علمی ذخیرہ ان اسباق کی توثیق کرتا ہے جو انسان شہد کی مکھیوں کی اجتماعی فیصلہ سازی کے عمل سے سیکھ سکتے ہیں۔ درحقیقت شہد کی مکھیوں کے پاس اس سیارے کا سب سے بہترین اجتماعی فیصلہ سازی کا طریقہ ہے۔ اس مثال سے سبق حاصل کرتے ہوئے شوریٰ کی مناسب ترین تعریف اجتماعی فیصلہ سازی کے ایک نظام سے کی جاتی ہے جہاں عوامی قائدین ان علمی حلقوں کا استعمال کرتے ہیں جو مزید معلومات کے حصول یا زیر غور متبادل پالیسی کے لیے تائید جمع کرنے کے حوالے سے مواصلت کے جاری عمل میں لازمی طور پر عوام کو شامل کریں۔ چناں چہ یہ عمل چند خصوصیات کے حامل ماہرانہ مشورے کے نظام کے ذریعے عوامی معاملات کے نظم و نسق سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اس میں قیادت، مہارت، عوامی شرکت، فیصلے کے معیارات، شہادت، ترغیب، تفتیش، رائے دہندگی یا انتخاب، ارکان کی ضروری تعداد اور اجماع شامل ہیں۔ اس نظام میں قیادت کو اہمیت حاصل ہے، لیکن یہ قیادت نظام پر حاوی نہیں ہے۔ بنیادی طور پر قیادت ان اعمال کو شروع کرنے کے لیے ذمہ دار ہے جو (۱) مسئلے کے تعین کے لیے مشورہ طلب کرتے ہیں، (۲) کامیاب نتائج کے لیے معیارات طے کرتے ہیں، (۳) ممکنہ ردّعمل تجویز کرتے ہیں، (۴) بہترین طرز عمل کے لیے عوام کو قائل کرتے ہیں، (۵) اور بہترین اجتماعی فیصلوں کو فروغ دیتے ہیں۔

شورائی عمل اسلام کی عوامی پالیسی میں ترغیب کی اہمیت کو واضح طور پر بیان کرتا ہے جو قوت فکر پر اسلام کے ذریعے دیے جانے والے زور کی نشان دہی کرتی ہے۔ قرآن صرف احکامات جاری نہیں کرتا، بلکہ ترغیب، حوصلہ افزائی اور عقل کے استعمال کو ضروری قرار دینے کے لیے مختلف وسائل بھی استعمال کرتا ہے۔ شورائی طریقۂ کار مسلمانوں کو مختلف راہوں پر متعلقہ عوام کا تعاون کرنے کی اہمیت سے واقف کراتا ہے۔ قرآن کے مختلف بیانوں میں اور قیام امن کی مساعی میں خدا کے پیغمبروں کے ذریعے اپنائی جانے والی ترغیبی تکنیک کی تشریح موجود ہے۔ عوام کو کسی مخصوص طرز حیات یا طرز عمل کے لیے قائل کرنے کا عمل سب سے زیادہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں نظر آتا ہے جنھیں اسلام کے پیغام کو بڑی حد تک مابعد الطبیعی مظاہر کے بغیر پہنچانا تھا، جب کہ یہ مظاہر دیگر انبیا کی مساعی کے لیے معاون تھے۔ ترغیب پر زور دینا ہی توہم پرستی، مابعد طبیعیات توقعات اور آمریت پسندی کے خلاف واضح حکم تھا۔

فوائد کے حصول اور نقصانات سے اجتناب سے متعلق امور میں عوام کو شامل کرنے کے لیے مقاصد شریعت کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ ہم فیصلوں کا جواز کس طرح پیش کرتے ہیں؟ عوامی پالیسیوں کا ہدف کس چیز کا حصول ہونا چاہیے؟ کون سی چیز عوامی مفاد کی تشکیل کرتی ہے؟ مقاصد شریعت کی تفہیم اسلام کے دور اول سے ہی واضح رہی ہے۔ تاہم اس کی رسمی تشریح دسویں صدی میں اس وقت تک سامنے نہ آسکی جب علما کی ایک مخصوص جماعت نے اپنے معاصرین کو متون کی تفسیر اور فتاویٰ جاری کرتے وقت قانون شریعت کے مقاصد کو پیش نظر رکھنے پر آمادہ کرنے کے لیے اس طرزِ فکر کی اپیل کی۔

اپنی روایتی صورت میں مقصدی طرزِ فکر چھ بنیادی امور کے تحفظ پر توجہ مرکوز کرتا ہے ان میں عقیدہ، زندگی، دماغ، اولاد، دولت اور عزت شامل ہیں۔ متقدمین علما کا اصرار تھا کہ قانون الٰہی کا مقصد ان فوائد کے علاوہ کسی اور چیز کا حصول نہیں ہے۔ اپنی وسیع تر کشش اور عام کردار کی وجہ سے مقاصد شریعت الگ الگ عقائد سے تعلق رکھنے والے مختلف النوع افراد اور جماعتوں کی

شمولیت کے لیے ممکنہ طور پر ایک آفاقی مطمحِ نظر پیش کرتا ہے۔ بطور خاص عہد بہ عہد ارتقا کی وجہ سے یہ دیگر شعبوں کے علاوہ حکم رانی اور پالیسی پر اپنے اطلاق کے لیے بھی ایک عملی اور نظریاتی فضا تخلیق کرتا ہے۔

حکومت اور پالیسی کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو مقاصد شریعت اخلاقیات اور دین کے مابین ایک اہم امتیاز کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ قرآنی اخلاقیات کو اہلیت کے بغیر مذہبی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شیخ عبداللہ دراز مرحوم نے مختصر انداز میں یہ واضح کیا ہے کہ قرآن زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے، جب کہ عبادات پر مشتمل دینی عنصر محدود اور ذاتی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ ثانیاً اس زندگی میں مجوزہ اخلاقیات کی تصدیق انسانی ضمیر، قانونی طاقت اور ہر انسان کے اس اختیار کے ذریعے ہوتی ہے جس کی بنیاد پر وہ خیر کے حصول کی سعی اور شر سے اجتناب کرتا ہے۔ چناں چہ قرآن صرف خوف و امید پر انحصار نہیں کرتا، بلکہ وہ توجہ، قوت فہم اور عقل انسانی کی برتری کا تقاضا کرتا ہے۔ اخلاقیات اور دین ایک دوسرے کی تشریح نہیں کرتے ہیں۔ مذہب کے اثباتی قانون سے پہلے ہی عقل کا وجود تھا۔ آخرالذکر کی بدولت ہی ہم مذہبی اور فطری دونوں قوانین کی تشکیل اور ان کو قبول کرتے ہیں۔ درحقیقت مذہبی قانون صرف ایک نقطۂ آغاز پیش کرسکتا ہے، پھر عقل عام وہاں سے اپنی بہترین قوت فہم کا اطلاق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس توضیح کی روشنی میں مذہب اسی وقت ایک محرک کی شکل اختیار کرتا ہے جب ہم ارادیت و دانستگی کی صفت کو زیرِغور لاتے ہیں۔ پالیسی اور حکم رانی کے معاملے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی مآخذ سے مستنبط ہونے والی تجویزوں کو خیالات کے بازار میں اختلاف لازماً قبول کرنا ہوگا جس کے ذریعے وہ یا تو راجح قرار پائیں گی یا مسترد کردی جائیں گی۔ انفرادی ارادے ذاتی طور پر کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔

حکومت کا مقصدی طرزِ فکر واضح طور پر اصولی نوعیت کا ہے جو بلا تامل قدر کے تمام اصولوں سے پہلے رحم دلی کے اخلاقی اصول کو اپناتا ہے۔ خدا کی تمام صفات میں صفت رحیمی پر سب سے

زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چناں چہ اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت کا بنیادی مقصد رحم دلانہ جسمانی اور اخلاقی تعلقات پر مبنی ہمہ جہت انسانی فلاح ہے۔ رحم دلی بلا شبہ مقاصد شریعت پر مبنی حکومت کے لیے امتیازی خصوصیت کا درجہ رکھتی ہے اور جو لوگ اس میدان میں طبع آزمائی کے خواہاں ہیں انھیں نہ صرف اس کا اعتراف کرنا چاہیے، بلکہ ان کے اندر رحم کے تقاضوں کو نظریاتی اور عملی سطح پر بروئے کار لانے کا حوصلہ اور طاقت بھی ہونی چاہیے۔ یہ امر حیران کن نہیں کہ تاریخ کے سب سے مقبول اور قابل قدر قائدین اور قومیں وہ رہی ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ رحم دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

مقصدی طرزِ فکر کی صفت ملائمت ہی اس کو فقہ سے آگے بڑھ کر وسیع کردار ادا کرنے کے لیے موزوں بناتا ہے، تاہم عوامی پالیسی کے تقاضے ایک مستحکم منہاجیاتی میکانزم تیار کرنے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اولاً اس دعوے کو بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے کہ ریاست کی نوعیت نیز پالیسی کی اساسی اور عملی بنیادوں کے حوالے سے شریعت کی رہنمائی بہت کم ہے یا نہیں ہے۔ وحی الٰہی اور احادیث میں موجود مواد کی وسعت کو سمجھنے والے دماغ کے لیے شریعت میں سیاست اور پالیسی کے حوالے سے وافر علم موجود ہے، جسے کسی بھی درپیش مسئلے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چناں چہ اسلام کی عوامی پالیسی روایتی فقہا کے ذریعے شریعت پر مسلط کردہ سطحی حدود کو قبول نہیں کر سکتی، اور نا ہی 'غیر محدود مفادات' کے نسبتاً غیر منظّم اصول کی تصدیق کر سکتی ہے جس کا اختراع فقہا نے ان قوانین اور فیصلوں کے بیان کے لیے کیا، جو قانون اسلامی میں معتبر تو ہیں لیکن نصوص میں واضح طور پر مذکور نہیں۔ بیان، مکالمہ، مثال، اطلاع، ترغیب، مشاہدہ، تلمیح، استعارہ، تکرار، مسائل، دلائل وغیرہ سمیت قرآن نے متعدد تکنیک پیش کی ہیں جو امور عامہ کے حوالے سے جدید اور مفید دریافتوں تک ہماری رہ نمائی کر سکتی ہیں۔

اس باب میں اسلام کی عوامی پالیسی کے اہم امور کو نمایاں کیا گیا ہے۔ فیصلہ سازی کے لیے شوریٰ کو ایک ضروری اور لازمی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اس میدان میں کام کرنے والوں کے لیے ترغیب کو ایک بنیادی وسیلے کے طور پر تجویز کیا گیا ہے، عمومی اہداف کے طور پر

مقاصد شریعت کی سفارش کی گئی ہے، جب کہ اصلاح کو پسندیدہ نتائج کے طور پر، رحم دلی کو اعلیٰ ترین قدر اور اخلاقیات کو ایک لازمی اساس کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اسلام کی عوامی پالیسی کا مطالعہ شروع کرنے کے لیے مقصدی طرزِ فکر کا قبول کرنا ایک اہم پیش رفت ہے جس کے لیے تنقیدی جستجو اور عالمی ماہرین کی ضرورت ہوگی۔

باب دوم

مسلمان اور حکم رانی کی الجھنیں

اس باب میں اس بات سے بحث کی گئی ہے کہ مسلمان تین با اختیار نمائندوں کے زیر اثر ہیں۔ان میں نظام حکومت سے قطع نظر ریاست،فقہا،علما اور ائمہ کا روایتی مذہبی نظام،اور ایک ایسا دماغ شامل ہیں، جو عمومی حیثیت سے کج روی کا شکار اور اپنے عقائد کے مشمولات کی آزادانہ طور پر دریافت کرنے کی عدم اہلیت پر یقین رکھتا ہے۔ یہ تینوں نمائندے نیز جس طرح سے وہ باہمی طور پر کام کرتے ہیں، وہ اس دشواری کی نمائندگی کرتے ہیں جس پر مسلمانوں کو لازماً قابو پانا چاہیے اگر وہ پالیسی اور حکم رانی کے حوالے سے شریعت میں پیش کردہ طرزِ فکر کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔

ایک مختصر تاریخی نقطۂ نظر کی شمولیت کا مقصد صرف اس بات کو نمایاں کرنا ہے کہ حکام، علما اور عوام کے درمیان فروغ پانے والا رشتہ کس طرح دور جدید کی مشکلات کے لیے دور رس مضمرات کا حامل تھا۔ جو نظریات شریعت کی رعایت کرنے والی اسلامی حکم رانی کے سنہرے دور کو پیش کرتے ہیں وہ ہماری موجودہ مشکلات کی اطمینان بخش توجیہات پیش کرنے سے قاصر ہیں، جو عوامی معاملات میں شریعت کے تئیں عمومی ناپسندیدگی یا خوف کو ظاہر کرتی ہیں۔ برسر اقتدار طاقتوں کے ساتھ مسلمانوں کے حقیقی تاریخی تجربات کو سمجھنا اہم ہے، تاکہ تاریخ کے ایک افسانوی ورژن کو جس نے مسلم اقوام کی معاشی، انتظامی، سائنسی اور تہذیبی قیادت کو بہترین حکم رانی کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔

قومی ریاستوں کے عہد جدید سے قبل مسلمانوں پر خاندانی سلاطین کی حکومت ہوا کرتی تھی، جن کی بنیاد زیادہ تر قبائلی وفاداری پر ہوتی تھی، چناں چہ وہ وسیع تر عوامی شراکت کو قبول کرنے یا اس

کو خوش آمدید کہنے کے روادار نہ تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کا فطری تنوع حکم رانی اور قیادت کی سطح پر ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اس طرز حکومت کا نتیجہ حکم راں اور رعایا کے درمیان واضح اختلاف کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مختلف شاہی گھرانوں کے حکم رانوں اور عوام کے درمیان جس نوع کے رشتے قائم ہوئے ان میں ایک مذہبی ادارے کے ذریعے اعتدال پیدا کیا جاتا تھا جو عام طور پر سیاست کی حدود میں رہ کر ہی فقہ اسلامی کی تفہیم و تشکیل کرتا تھا، جس کی وجہ سے اس میں انفرادی اور نجی رجحان در آتا تھا۔ حکام کو شریعت کے ان پہلوؤں کی تشریح و توضیح سے بے خبر رکھا جاتا تھا جو بہتر حکم رانی کے خدوخال طے کرتے ہیں، جب کہ عام آدمی اختیار کو استعمال کرنے، حقوق طلب کرنے اور بوقت ضرورت قیادت کو تبدیل کرنے کے لیے مطلوب علم اور وسائل سے محروم تھا۔

خاندانی حکم رانی نے حکم راں، فقہا اور عوام کے درمیان جو خط فاصل کھینچی اس کی وجہ سے امت مسلمہ کے سیاسی شعور پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس کے سبب ایک ایسا ماحول فروغ پایا جہاں مذہبی علما نے رفتہ رفتہ خود کو اور اپنے میدان عمل کو عام مسلمانوں اور ان شعبوں میں کام کرنے والے لوگوں سے الگ کر لیا جو واضح طور پر فقہ سے متعلق نہیں تھے۔ صرف مذہب کو ایک پیشے کے طور پر اپنانے والوں کے لیے مناسب ہدایت فراہم کرنے کی وجہ سے مذہبی تعلیم رفتہ رفتہ اسی اشرافیہ نظام کا عکاس بن گئی۔ عام مسلمان ان تمام معاملات میں ان افراد پر زیادہ سے زیادہ بھروسا کرنے پر مجبور ہو گئے، جہاں مذہبی ہدایات کو لازمی سمجھا جاتا تھا، جب کہ شریعت کا ہمہ گیر مزاج ایک مختصر مدت تک باقی رہنے والے عہد رفتہ تک سمٹ کر رہ گیا۔

ان تاریخی تبدیلیوں کو آگے بڑھانے والا ایک بڑا افسانہ یہ ہے کہ حکم رانی کے اکثر امور میں شریعت خاموش ہے، سوائے ان چند تصورات کے جو عجیب و غریب انداز میں آمریت کو ہی مستحکم کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک افسانہ دنیاوی حکم رانی کے معاملات میں 'خدائی اقتدار اعلیٰ' کا تصور ہے۔ مخلوق پر حکومت کرنے کے سلسلے میں خدائی اقتدار اعلیٰ تو ایک غیر متنازع فیہ مسئلہ ہے، تاہم یہ ہماری روز مرہ زندگی کی ان تمام تفصیلات میں خود کو ظاہر نہیں کرتا جہاں ہم اپنی مرضی سے عمل

کرتے ہیں۔ چناں چہ یہ عقیدہ اور تبلیغ کہ قانون کا واحد ماخذ خدا ہے، نہ صرف غلط بلکہ خطرناک ہے۔ واضح اظہارات سے قطع نظر انسان اپنی عقل کو استعمال کر کے کسی عمل کے مقصد اور اخلاق کی بنیاد کے درمیان قانون سازی کا عمل انجام دیتا رہتا ہے۔ ہر سطح کی حکم رانی انسان کی اپنی تخلیقی صلاحیت اور اقتدار اعلیٰ کا تقاضا کرتی ہے۔

حقیقی اسلامی حکم رانی تجدید کے مسلسل عمل کے ذریعے حکم راں طبقہ اور عوام کے درمیان رشتے کو فروغ دیتی ہے۔ مسلمان کسی مطلق یا خدائی نمائندگی کی بدولت انسانی اختیار کے تابع نہیں ہوتے ہیں، بلکہ اس میں اخلاقی اصول پر مبنی ان کی ذاتی منظوری کو دخل ہے جس کا اظہار اجتماعی طور پر ایک متفقہ سیاسی عمل کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس رشتے کو تاریخی طور پر نظر انداز کرنے یا اس کو ایک اختیاری چیز کے درجے میں رکھنے کی وجہ سے سیاسی طور پر ایک غیر پختہ قوم وجود میں آئی جو نوآبادیات (اور جدیدیت) کے ذریعے برپا کی جانے والی تبدیلی کے لیے بڑی حد تک تیار نہیں تھی۔ اس کے باوجود معاصر سیاسی کارکنان خلافت، امت، شوریٰ اور بیعت جیسے تصورات کی تاریخی تفہیم کے ساتھ جس طرح باصرار چمٹے رہے اس کا نتیجہ محدود تخلیقیت، محدود، تاثیر اور قبولیت میں کمی کی شکل میں برآمد ہوا۔

مگر عالم اسلام کی موجودہ حالت کا سب سے اہم ذمہ دار روایتی مذہبی ادارہ ہے۔ جس طرح رومن کیتھولک مذہب میں اختیار کا مرکز ویٹیکن ہے، اسلام کا معاملہ اس طرح نہیں ہے، تاہم فقہا اور علما نے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ یہ مذہبی ادارہ خود کو موکد کردار، ذمہ داریوں اور علمی حدود میں رہ کر کام کرنے والے ایک طاقتور، مردسری، مرکزیت کا حامل، بالاتازیریں پہلے سے طے شدہ ڈھانچے کے طور پر پیش کرے۔ چناں چہ اس ادارے نے شریعت کی تعریف، فقیہ اور عالم کے لیے معیارات، اعلیٰ تعلیم گاہوں کی منظوری اور مسلمانوں کے لیے معمول کی چیزوں کے جواز یا عدم جواز کا مسئلہ اپنے ساتھ خاص کر رکھا ہے۔ دیگر شعبوں کے اسکالرس، خواتین اور جوانوں کی آرا کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔

اپنی تنگ قانونی تربیت سے ماورا تحقیق کے میدان میں فقہا کے بے جا تجاوز کے سبب عالمی سطح پر مسلمانوں کے لیے سنگین نتائج سامنے آئے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ خطرناک معاملہ فقہا اور علما کا ریاستی اہلکاروں سے علانیہ یا خفیہ تعلق رہا ہے، حالانکہ وہ یہ جانتے تھے کہ وہ حقوق انسانی کی سنگین پامالی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ رحم دلی، فلاح اور انصاف کو شریعت میں مرکزی حیثیت حاصل ہونے کے باوجود علما اور فقہا کے لیے بہت مشکل تھا کہ وہ حکام کو ان اصولوں پر توجہ دینے کا مشورہ دیں۔ تاہم اس معاملے میں عام مسلمانوں کی بھی بڑی ذمہ داری ہے۔

صدیوں تک عقیدہ کی تلقین، قانونی بندشوں اور جبر کی وجہ سے عقیدے کے معاملات میں غور و فکر کے حوالے سے مسلم ذہن کی آمادگی واہلیت اور عقیدے کے مشمولات کی تشکیل، تصدیق اور اصلاح کی صلاحیت متاثر ہوئی ہے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ اسلام کی پالیسی اور حکم رانی نے جس چیز کے علم کو لازم قرار دیا ہے وہ بہت زیادہ محدود نہیں ہے۔ خالص دنیاوی سے لے کر زیادہ سنجیدہ معاملات سے متعلق کئی مسائل کے سلسلے میں رائے کے لیے مسلمان مقامی مذہبی قائدین یا سوشل میڈیا کے ذریعے معروف بیرونی اسکالرز پر بھروسا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ امر دشوار کن نہ ہو، تاہم یہ مہارت اور صحت کے ساتھ اسلام کے بنیادی مآخذ کا حوالہ دے کر پیچیدہ جدید شکلوں میں فلاح انسانی میں اپنا حصہ ادا کرنے کی عدم اہلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بایں ہمہ پس ماندہ گروہوں کا ایک بڑھتا ہوا حلقہ جس میں روایت اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے مرد، خواتین، جوان اور علما شامل ہیں، اس تنگ قانونی تسلط کی خاموش اتباع پر سوال اٹھا رہے ہیں جس نے زیادہ تر حالات میں خود کو ان حقائق اور ضروریات سے الگ کر لیا جن کا مسلمانوں اور غیر مسلموں کو آج سامنا ہے۔ انسانی حقوق اور بطور خاص خواتین کے حقوق اور دیگر اہم عوامی مسائل کو کم تر سمجھنے اور ان سے غفلت برتنے کے ساتھ مذہبی اداروں کے امتناعی فرامین کی وجہ سے یہ افراد اور گروہ تنگ آ چکے ہیں۔ وہ معاصر مشکلات کے مؤثر حل کی سرگرم جستجو میں ہیں اور کسی خدائی حوالہ کو قبول کرنے کو تیار بھی ہیں۔

بہر کیف تخلیقی فکر کے حامل اسلامی مفکرین اکثر با اثر ہم مذہبوں کے ذریعے غیر اہم بنا دیے جاتے ہیں اور غیر مذہبی ہم منصبوں کے ذریعے بے اثر سمجھے جاتے ہیں۔ یقیناً مسلمانوں کے لیے اور مسلمانوں کی جانب سے صحیح اسلامی حکم رانی اور عوامی پالیسی، جس کی تشریح اس پوری کتاب میں پیش کی گئی ہے، کی جستجو ایک سہ نکاتی مطمحِ نظر کا تقاضا کرتی ہے جن کا مقصد لوگوں کو سیاسی تسلط، روایتی قانونی علما اور فقہا غلبے، اور سب سے بڑھ کر ان کے ذاتی تامل، ذاتی اعتماد کے فقدان اور خود سے مسلط کردہ شریعت کی روح سے ناواقفیت سے آزادی دلانا ہے۔

باب سوم

مقصدی مطالعات کی تاریخی بنیادیں

یہ باب مقصدی مطالعات کی تاریخی بنیادوں کے لیے خاص ہے اور اس طرح یہ ایمان، زندگی، دماغ، اولاد، دولت اور عزت کے تحفظ کے بارے میں ان کی قدیم تشریح سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ اسلامی مطالعات میں مقاصد شریعت سے متعلق علمی ذخیرے کا اہم حصہ ہے، تو جو لوگ پالیسی اور حکم رانی کے اس مطمح نظر کی توسیع کے خواہاں ہیں وہ لازمی طور پر مناسب نقد و جرح کو بروئے کار لانے کے خواہش مند ہوں گے۔ اسلامی پالیسی اور حکم رانی میں اس کے قدیم اطلاق کے برعکس مقصدی مطالعات کا وجود دسویں صدی کے ان علما کی تصنیفات سے سامنے آیا جنھوں نے فقہ اسلامی اور مسلمانوں کے عمل اور جن چیزوں کو انھوں نے شریعت کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دیا تھا ان کے درمیان کے فاصلے کو پاٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس سعی سے معلوم ہوتا کہ کچھ فقہا نے کس طرح اس تاریخی لمحے کے نقص کا ادراک کیا جس میں انھوں نے زندگی گذاری اور یہ نکتہ شریعہ ماڈل کے غلبے کے حوالے سے ان کی تشکیک کی دلیل بھی ہے۔ پوری تاریخ میں اس مطمح نظر کے ممتاز ترین حامیوں کے کارنامے عوامی فلاح اور مفادات کے حوالے سے مسلمانوں کے طویل تفکرات کو ظاہر کرتے ہیں۔ معاصر مقصدی مطالعات میں اس نکتے کا اظہار کم نہیں ہے جہاں متعدد اسکالرز مبادیات کی ہماری تفہیم کو ترقی دیتے آ رہے ہیں۔

مقاصد شریعت کے قدیم عمل سے عصری معنویت کے حامل متعدد اہم نکات کا ظہور ہوتا ہے۔ اولین خلفا کی حکومتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصدی طرزِ فکر کا ارتکاز واضح طور پر مسئلہ اور تناظر پر تھا۔ علم، اقتدار اور تقویٰ کے مجموعے نے ان قائدین کو ایسی روحانی و مادی قوت عطا کی

جس سے وہ اپنی حکم رانی میں اسلام کی اصل روح کی پیروی کر سکیں گر چہ یہ نصوص کے لغوی مفہوم سے متضاد نظر آتا ہے۔ اصلی تعبیر کے لحاظ سے یہ مقاصد فقہ کی سخت مبادیات کے پابند نہیں تھے، چناں چہ ان میں وسیع تر علمی آزادی کو قبول کرنے کی گنجائش تھی۔ تمام مقامی اور بیرونی علمی شعبوں کو عوامی پالیسی کے مسائل پر منطبق کیا گیا۔ انسانی عزت واحترام کی ذمہ داری اور شوریٰ کو عوامی معاملات میں نسبتاً مرکزی حیثیت دی گئی جو بہر قیمت 'ثبات' کے آئندہ تفکرات کے بالکل برعکس تھا۔

خاندانی حکومت کی پوری طویل اسلامی تاریخ میں آمریت کے فروغ نے ان ذمہ داریوں کو ختم کر دیا۔ خاندانی حکومت کا نتیجہ روحانی، اخلاقی اور مادی اتحاد کی قیمت پر قانون اور ریاست کی تفریق کی شکل میں ظاہر ہوا جو حکم رانی کے سابقہ ادوار کا خاصہ تھا۔ عوامی معاملات کو چلانے میں علما اور فقہا کے بڑھتے ہوئے کردار کی وجہ سے ان کا اصل مذہبی اور علمی دائرہ پس منظر میں چلا گیا۔ اگر حکومت استثنائی طور پر قانون میں مداخلت کر رہی تھی، تو اس کی وجہ ان کی عظمت نہیں تھی، بلکہ اس کی وجہ خاموش مفاہمت تھی کہ فقہا حکم رانی اور سیاسی اقتدار کی تبدیلی کے سلسلے میں کوئی فتویٰ صادر نہیں کریں گے۔ نیز وہ صاحبان اختیار کی خواہی نہ خواہی مقبولیت کو یقینی بنائیں گے۔ اس کے نتیجے میں ایک جزوی، منقسم اور شریعت کا ایک مختصر مطمح نظر سامنے آیا، یعنی ایک ایسی حکم رانی جو اپنی رعایا سے بہت حد تک جدا اور ایک ایسی عوام جو اپنے حکم رانوں کے سامنے اپنے حقوق ثابت کرنے کی اہلیت سے عاری تھی۔

نتیجتاً مقاصد شریعت کے متقدمین علما فقہ اسلامی اور مسلمانوں کے عمل اور جس چیز کو وہ شریعت کا مقصد اعلیٰ سمجھتے تھے ان کے درمیان خلا کے حوالے سے فکر مند تھے۔ ابوالمعالی الجوینی (وفات: ۱۰۸۵) نے کہا کہ قانونِ اسلامی کا مقصد ایمان، روح، دماغ، شرم گاہ اور لوگوں کی دولت کی حفاظت کرنا ہے۔ ابوالحامد الغزالی (وفات: ۱۱۱۱) نے مقاصد کو مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ ترجیح دی: ایمان، روح، دماغ، اولاد اور دولت۔ العزابن عبدالسلام (وفات: ۱۲۰۹) نے فقہی مسائل

اوران کے مقاصد کے درمیان ربط پر روشنی ڈالی۔شہاب الدین القرافی (وفات:۱۲۸۵) نے واضح کیا کہ اگر دیگر مقاصد کی بنیاد جسمانی سزا سے متعلق مسائل پر ہوتو ناموس کے تحفظ کا اضافہ کیا جائے گا۔شمس الدین ابن القیم (وفات:۱۳۵۰) نے الحیل پر قانونی تنقید پیش کی۔ابن تیمیہ (وفات:۱۳۲۸) نے دیگر چیزوں کے علاوہ انصاف، نیکی، آئینی حقوق اور سائنسی مہارت سمیت وسیع تر اقدار پیش کرنے کی کوشش ہے۔متقدمین علمائے مقاصد میں سب سے مشہور ابواسحاق الشاطبی (وفات:۱۳۸۸) نے واضح کیا کہ شارع کے مقاصد کا تعین کس طرح ہوسکتا ہے۔ ان کے بعد آنے والے تمام حضرات نے یا تو شاطبی کے کاموں کی تلخیص کی یا ترتیب نو۔

متقدمین علما کے کارناموں نے مجموعی طور پر ان چیزوں کی تفہیم کی اہمیت اور تعظیم کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جن کو وہ قانون اسلامی کے اعلیٰ مقاصد تصور کرتے تھے۔ان کی علمی کاوشوں میں اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ اس کام میں کچھ غلطی رہ گئی تھی اور اگر فقہ اسلامی کو اپنا مطلوبہ ہدف پورا کرنا ہوتو اس کی اصلاح ناگزیر ہے۔جب تک فقہ اسلامی کی مبادیات میں مقاصد کو شامل نہ کیا جائے اور کوئی بھی فقہی رائے قائم کرتے وقت یہ مقاصد ایک عالم کے ذہن میں سرفہرست نہ رہیں، اس وقت تک اس بات کا امکان باقی رہتا ہے کہ قانون اپنے مقصد سے منحرف ہو جائے۔ چناں چہ مقصدی نقطۂ نظر کا ہدف قانون کے لیے ایک اخلاقی ڈھانچہ فراہم کرنا قرار پایا۔

مقصدی طرزِ فکر کی بڑی خصوصیات ہی متعدد شعبوں، بطور خاص حکم رانی اور پالیسی پر اس کے اطلاق کو مناسب قرار دیتی ہیں، جو اس کے لیے اصل معنوں میں سازگار ماحول سمجھے جاتے ہیں۔معاصر اسکالرز نے ہر مقصد کو جدید زندگی کی ضروریات کے حصے کے طور پر پیش کر کے اس طرزِ فکر کی معنویت کو دوبالا کرنے کی کوشش کی ہے۔چناں چہ تحفظ دین کا تصور آزادی مذہب کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ یہ مقصد اسلامی اخلاقیات، عقیدے کے انتخاب کی آزادی اور اس نوع کی آزادی کے اظہار کے لیے ایک محفوظ عوامی ماحول کی اہمیت کی طرف توجہ مبذول کرتا ہے۔ عوامی پالیسی سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس وقت تک فرد اور گروہ کی سطح پر حق انتخاب کا احترام

کریں، جب تک وہ دوسروں کے حقوق پامال نہ کریں، معاشرے میں مثبت کردار ادا کرتے رہیں اور اجتماعی طور پر طے شدہ عوامی اصولوں کا احترام کرتے رہیں۔

زندگی کا تحفظ اصطلاح کے میدان میں نمایاں ترقی پر منحصر نہیں رہا ہے سوائے اس معنی میں کہ اس کو کیسے حاصل کیا جائے۔ عمومی طور پر یہ مقصد جسمانی فلاح کی ضروریات اور جسمانی مضرتوں کی روک تھام سے متعلق رہا ہے۔ ان مقاصد کے لیے عوامی پالیسی قومی تحفظ، غیر شہریوں تک تحفظ کی توسیع اور ماحولیات کے تحفظ پر توجہ کرسکتی ہے۔ مستقبل میں یہ تصور مزید ابھر کر اس حقیقت کی عکاسی کرسکتا ہے کہ زندگی کا انحصار محض جسمانی مظاہر سے آگے بھی بہت سی چیزوں پر ہے۔ شریعت تمام زندہ مخلوقات کے باہمی انحصار کے متعلق ایک واضح نظریہ رکھتی ہے جو (تمام نسلوں کے) سماجی گروہوں اور ان رشتوں کے پیچیدہ جال کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتا ہے جن پر ان کی بنیاد ہے۔

تحفظ اولاد کا تصور خاندانی اکائی کے ایک وسیع تر تصور کا احاطہ کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقصد سماجی اور معاشی ترقی میں خوش اسلوبی سے کام کرنے والے خاندانوں کے کردار کے اعتراف کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ چناں چہ عوامی پالیسی کو لازمی طور پر نکاح اور بچوں سمیت خاندانی فلاح کے فروغ پر توجہ دینا چاہیے۔ اس بات کا اعتراف کرنا اہمیت سے خالی نہیں کہ متقدمین علما کے نزدیک اس مقصد کی بنیاد زنا کی سزا تھی۔ اگر ہم اس بنیاد پر غور کریں تو زیادہ مناسب مقصد عوامی اخلاقیات کا تحفظ قرار پاتا ہے، نہ کہ ایک بچے کے شجرۂ نسب کا علم، جس کا منطقی نتیجہ اولاد کا تحفظ ہے۔ زنا کے الزام سے متعلق چار گواہوں کی موجودگی جیسے سخت احکامات سے یہ بات واضح ہے۔ عوامی اخلاقیات کی واضح خلاف ورزی کے علاوہ اس طرح کے الزام سے متعلق شرائط انفرادی رازداری اور جھوٹے الزام سے تحفظ کے مقصد کو بھی واضح کرتی ہیں۔ عوامی اخلاقیات اور انفرادی رازداری کا تحفظ عالمی دل چسپی کا موضوع ہے۔ اسی وجہ سے مقاصد شریعت شہریوں کی ذاتی زندگی میں قومی اور ریاستی مداخلت کی حدود کو واضح کرتے ہوئے انسانی رویے کے لیے وسیع تر آزادی کو یقینی بناتے ہیں۔

تحفظ دولت کا تصور سماجی معاشی ضروریات کا احاطہ کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہے، جس میں افزائش، ترقی، مالیاتی گردش، سماجی فلاح اور معاشی مساوات شامل ہیں۔ عوامی پالیسی کا کام ایک قانونی اور سماجی معاشی نظام کا قیام ہے جو جائیداد کی افزائش اور سماج کی فلاح کے لیے ان کی تخلیق منتقلی کے تمام جائز وسائل سمیت عوامی اور انفرادی جائیداد کی حفاظت کرے۔ تمام روایتی مقاصد میں دولت کا تحفظ بطور مقصد شریعت شاید سب سے کم قابل دفاع ہے۔ سرقہ (چوری) کی سزا کا مثبت نتیجہ دولت کا تحفظ نہیں ہے، بلکہ ہمہ جہت انسانی تحفظ کی حرمت اور ضمانت ہے۔ چوری کی حد میں جو شدت ہے وہ (واضح رہے کہ سماجی تناظر کے سخت تقاضے کے حوالے سے اس کی حقیقی روح کے ساتھ عموماً ناانصافی کی جاتی ہے، اس لیے کہ غربت، ناانصافی، عدم مساوات جیسے حالات میں اس کا اطلاق نہیں ہوتا) تجاوز اور تشدد سے آزادی کے لیے اسلام کی تاکید کی عکاسی کرتی ہے، جس میں ریاست اور صاحبان اقتدار کا تجاوز بھی شامل ہے۔ اس خیال کے بالکل برعکس کہ دولت شریعت کا ایک مقصد ہے قرآن دینے اور بانٹنے کی سب سے فراخ دلانہ شکلوں کی تلقین کرتا ہے۔ دولت صرف وسیلہ ہے اور ایک وسیلہ ہی ہوسکتی ہے، کبھی مقصد نہیں۔

عزت کے تحفظ کا تصور اس قدر وسیع ہے کہ اس میں انسانی وقار اور انسانی حقوق بھی شامل ہیں۔ اس لحاظ سے عوامی پالیسیوں کو لازمی طور پر حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ (Universal Declaration of Human Rights) میں مذکور تمام نہیں تو بیشتر حقوق کو شامل ہونا چاہیے۔ ہر چند کہ خواتین کے حقوق یقینی طور پر تمام مقاصد میں شامل ہو سکتے ہیں، تاہم اس مقصد کے تحت اس کا خاص طور سے ذکر کرنا ناگزیر ہے، کیوں کہ دوسرے کسی بھی طبقے کو ان ثقافتی رسوم کی بنیاد پر اتنی شدت کے ساتھ نقصان نہیں پہنچایا گیا ہے جن کے مطابق تحفظ ناموس صرف مردانہ حق کے دائرۂ اختیار میں آتا ہے۔ معصوم لڑکیوں اور خواتین کی زندگی کو غیر منصفانہ انداز میں پامال کرتے ہوئے قتل ناموس کے واقعات دنیا کے بعض خطوں میں ابھی بھی واقع ہو رہے ہیں۔ گرچہ قتل کے ان واقعات کے سلسلے میں اکثر علما اور فقہا کی جانب سے سخت مذمت جاری کی گئی

ہے، تاہم تشدد اور استحصال کی تمام انواع سے لڑکیوں اور خواتین کے تحفظ پر ایک واضح، بے لاگ اور متفقہ موقف کی اب بھی ضرورت ہے۔ شریعت میں حقوق نسواں کو مضبوط انداز میں بیان کرنے، ان کا مطالبہ کرنے اور ان کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایسے حقوق ہیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ایک مقصد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

مقصدی طرزِ فکر کا ظہور ان اقدار کی تفہیم سے ہوا جو فقہا کے مطابق شریعت کی سخت ترین سزاؤں کی روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا سطور میں پیش کردہ چھ مقاصد اس طرزِ فکر کے پائیدار ترین کردار کی تشکیل کرتے ہیں۔ عقیدہ، زندگی، دماغ، اولاد، دولت اور ناموس کے تحفظ کی درجہ بندی میں جس قدر کفایت شعاری سے کام لیا گیا ہے وہ مقاصد کی کسی اور تشریح میں نہیں ملتی۔ ہر مقصد کی اصلاح اور حقیقت کو پیش کرنا نئی زمرہ بندیوں کو پیش کرنے سے زیادہ آسان رہا ہے۔ اس علمی جمود کی وجہ سے معاصر اسکالرز نے اس طرزِ فکر کی ثابت شدہ اساس کا احترام کرتے ہوئے شریعت کے وسیع اور عمیق تر معنی کا احترام کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

باب چہارم

ایک جدید شعبۂ علم کے قیام کی مشکلات

عقیدہ، زندگی، دماغ، اولاد، دولت اور ناموس کے تحفظ میں پیش کردہ روایتی مقصدی طرزِ فکر کی کفایت شعارانہ نوعیت حکم رانی اور عوامی پالیسی کے طلبا کے ذہن میں شدت کے ساتھ گونجتی رہتی ہے۔ تاہم عظیم تر تعلیمی اور عملی قوت کے حصول کے پیش نظر قانون سے حکم رانی کی طرف منتقلی کا لازماً جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اس باب میں اسلام کی عوامی پالیسی اور حکم رانی سے متعلق ایک مستند پروجیکٹ کو کامیاب بنانے کی راہ میں حائل بعض مخفی دشواریوں پر توجہ دی گئی ہے۔ چناں چہ اس باب میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ کس طرح سے شریعت اور فقہ کو روایتی طور پر ان کے اصل معانی کے مقابل سمجھا جاتا ہے، ان منہاجی تصورات سے بحث کی گئی ہے جو فقہ یا اصول فقہ کی مبادیات سے اخذ کیے جاسکتے ہیں، دو معاصر اسکالرز طارق رمضان اور جاسر عودہ کی تصنیفات کی معنویت اور کردار کا جائزہ لیا گیا ہے، اور آخر میں حکم رانی اور پالیسی مطالعات کے تقاضوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

شریعت کو بہتر انداز میں منزل اور غیر منزل علم یا مکتوب اور غیر مکتوب متن کی مکمل چھان بین کے بعد ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ قرآن میں شریعت کا واحد حوالہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہے: 'اس کے بعد اب اے نبی، ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو، اور ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔' (سورہ الجاثیہ: ۱۸) چناں چہ شریعت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجی گئی وحی اور ان طریق ہائے کار کا مجموعہ ہے، جن میں انھوں نے زندگی بھر اس وحی کو عملی جامہ پہنایا۔ شریعت سے متعلق ہمارے فہم کی واضح توسیع کے پیش نظر پالیسی اور حکم رانی کے منہجی نتائج کی تشریح ابھی بھی ہونی باقی ہے۔ اس

عمل کے نتائج صرف فقہ کی تشکیل کر سکتے ہیں، نہ کہ خود شریعت کی، جس کے قوانین نا قابل ترمیم ہیں اور جس پر علمی سعی کا ممکنہ اطلاق غیر محدود ہے۔

مذہبی دائروں میں فقہ نے مبسوط شواہد سے اخذ ہونے والے الٰہی احکام میں مہارت کے خاص معنی استعمال کیے ہیں۔ اپنے اپنے مخصوص تاریخی مواقع پر شریعت کے اطلاق کے حوالے سے مختلف فقہی مکاتب فکر کے ذریعے پیش کردہ فتووں کے ضخیم مجموعے کو عموماً فقہ کے ذریعے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآنی تصور کے مطابق فقہ کا سادہ مطلب فہم وادراک ہے۔ حکم رانی اور پالیسی کے لیے مقصدی طرزِ فکر فقہ میں اپنا نمایاں حصہ ادا کرتا ہے۔ چوں کہ یہ طرزِ فکر گذران وقت یا پس منظر کی تبدیلی کی وجہ سے بے اثر ہو جانے والے وسائل اور غیر منتہی نتائج کے درمیان فرق کرتا ہے، اس لیے فقہ کی انقلابی تفسیر نو اور اس کو تاریخی حیثیت دینا ممکن اور ضروری ہو جاتا ہے، کیوں کہ یہ شریعت کی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے انسانی معاملات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس توثیق کے بغیر ہم حکم رانی اور پالیسی کے جدید مسائل کے جائزے کے لیے اقدام نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمارے موجودہ حقائق کے علم کے لیے لازم ہے کہ وہ ماضی کی تفہیم کی تصحیح کے ساتھ اس میں ترقی اور اضافے کا سبب بنے۔

پالیسی اور حکم رانی مطالعات قانون اسلامی کے معروف قضائی نظریات پر دوبارہ غور کرنے کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ مختلف مکاتب فکر کے ذریعے استعمال کردہ طرزِ فکر حکم رانی اور پالیسی کے لیے معنویت کا حامل ہو سکتے ہیں، تاہم علما کو ان تکنیکوں کی اس طرح سے تشریح کرنے کی اب بھی ضرورت ہے کہ اس شعبے کی ضروریات منعکس ہو جائیں۔ اجماع، مفادات کے تعین، سد ذرائع، ترجیح اور قیاس سے متعلق کارروائیوں اور مشمولات کو اپنی جڑیں عوامی پالیسی کی ضروریات میں تلاش کرنا ہوں گی جس کے مسائل اور حدود مختلف ہیں۔

مزید براں یہ کہ رسوم و رواج، تسلسل اور اصحابِ رسول کی آرا سے متعلق اصولی فیصلوں کی شدت کو بھی پالیسی سائنسز کی معلومات کے ذریعے کم کیا جائے گا۔ بالفاظ دیگر ان مناہج کی تشریح اور اطلاق اس طرح سے ہو کہ وہ پالیسی اور حکم رانی میں مثبت کردار ادا کر سکے۔

تاہم متعدد فقہی اصولوں کو اسلام کی عوامی پالیسی کے مطالعے سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے لازمی طور پر مسترد کر دیا جانا چاہیے۔ بکھرے ہوئے استثنائی شواہد سے، چاہے ان کی تعداد جو بھی ہو اور چاہے وہ بنیادی مآخذ سے نکلتے ہوں یا فقہ سے، مخصوص مسائل یا مقاصد کے لیے تائید حاصلکرنا اس پس منظر اور ماحولیات کے باہمی انحصار کی مناسب تفہیم کے بغیر یقینی نتائج نہیں دے سکتے، جس میں ان مسائل کا نفاذ ہونا ہے یا مقاصد حاصل ہونے ہیں۔ یہ استقرائی منہج سے مربوط تیقن کو سوال کے دائرہ میں لاتا ہے جو قدیم مقصدی طرزِ فکر کی بنیاد تشکیل دیتا ہے۔

اسی طرح اسلام کی عوامی پالیسی نسخ کے اصول کو قبول نہیں کر سکتی۔ ایک یا ایک سے زائد آیات کے نسخ کا مطلب ان کو اس توجیہ کے ساتھ بے اثر بنا دینا ہے کہ اس کے لغوی معنی مابعد کی کسی آیت کے معنی سے متصادم ہیں۔ تاہم سیاقی خصوصیات نیز عالم یا فقہا کی علمی حدود کی وجہ سے تفسیر میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔ عوامی پالیسی کے مقصد سے بنیادی مآخذ کا مطالعہ تمام آیات اور وسیع تر کائنات کو کلی طور پر زیرِ غور لانے کا تقاضا کرتا ہے جس کی طرف بہت سی آیات بالواسطہ یا بلاواسطہ اشارہ کرتی ہیں۔

عوامی پالیسی کا مقصدی طرزِ فکر (کسی مسئلے کے حوالے سے) شارع کے سکوت کے نظریے کو بھی مسترد کر دیتا ہے۔ اگر آیاتِ احکام کے زمروں کے علاوہ شریعت کے ایک بڑے حصے کو نظر انداز کر دیا جائے اور جس غیر منزل علم کی طرف بنیادی ماخذ اشارہ کرتے ہیں اس کی وسعت کو مربوط کر دیا جائے تو ہم فقہ میں سکوت کا تعین آسانی سے کر سکتے ہیں۔ جب ہم پیچیدہ تر مناہج کو بروئے کار لاتے ہوئے تمام قرآنی متن اور مصدقہ مشمولات کی حامل صحیح احادیث کو شامل کرنے کے لیے اساسی مواد کی توسیع کرتے ہیں تو سکوت کے تصورات کو لازمی طور پر ثابت کیا جاتا ہے۔ رہی بات نسخ کی، تو سکوت کی توثیق زمان و مکان نیز عالم کی مہارت سے متعلق ہے۔ علمی صورت حال کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی روایتی فقہ کی ایک دوسری خصوصیت کی طرف توجہ مبذول کراتی ہے جس پر عوامی پالیسی کے مقصدی طرزِ فکر کو دوبارہ غور کرنا ہوگا، یعنی اجتماعی اور بین شعبہ جاتی مہارت کے

بالمقابل انفرادی حیثیت سے فقہاء پر انحصار۔ ماہرین کی جماعت نیز اہل علم اور دل چسپی رکھنے والے متعلقین کو مصروف کار کرنے کی اہمیت کا مقصد پالیسی کے باب میں عدم یقین کی کیفیت کو بڑی حد تک ختم کرنا ہے۔ اعلیٰ درجے کا یقین اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب ہم اپنے اس فہم کو ظاہر کرتے ہیں کہ کس طرح سے منزل اور غیر منزل متن اس جدید اور مفید علم کو پیش کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں جس کو ہمارے عہد کی مشکلات کے لیے استعمال کیا جاسکے۔

متعدد معاصر اسکالرز نے ان منہاجی مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ طارق رمضان اور جاسر عودہ مختلف نوع کی تاکیدات پیش کرتے ہیں۔ رمضان کہتے ہیں کہ کائنات سے متعلق ہمارے علم کے ذریعے لازمی طور پر متنی مآخذ کی توسیع ہونی چاہیے۔ اصول فقہ کے مآخذ کے لیے لازم ہے کہ وہ تمام انسانی علم کو، خواہ نیچرل سائنس ہو یا سوشل سائنس، مربوط کرے، اور اس کو اسلام کی اخلاقی حدود کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس بات کو ممکن بنانے کے لیے علمائے دین اور فقہا کو لازمی طور پر دیگر شعبوں کے ماہرین کے ساتھ باہمی تعامل کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مؤخر الذکر کو اسلامی اخلاقیات کی جستجو میں مساوی بلکہ برتر درجہ دیا جانا چاہیے۔ کچھ خوبی کے باوجود یہ تجویز پریشان کن ہے۔ اہم بات افراد کو بلند یا مساوی رتبہ دینا نہیں، خواہ ان کی مہارت جتنی بھی پختہ ہو، بلکہ شہادت کے وسائل اور خیالات سے مربوط استناد کی سطحوں کو منتقل کرنا ہے، کیوں کہ وہ مقاصد شریعت کی از سر نو تخلیق کرتے، ان کو تقویت بخشتے اور ان کا اظہار کرتے ہیں۔ ریویلیشن اور یونیورس کو رمضان اور دیگر اسکالرز کے نظریے کے مطابق دو کتابوں کے طور پر نہ دیکھا جائے، بلکہ ان کو ایک ایسی کتاب کے طور پر دیکھا جائے جو دو مرتبہ قرأت کا تقاضا کرتی ہے جس طرح خود قرآن بھی اس کا متقاضی ہے۔

نظامی طرزِ فکر (Systems Approach) کو استعمال کرتے ہوئے عودہ مقاصد کو قانون اسلامی کے فلسفہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ نظام کی پانچ منتخب خصوصیات بشمول ادراک، کلیت، رسائی، کثیر جہتی اور مقصدیت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ قانون اسلامی کی اصلاح کا مشورہ

بھی دیتے ہیں اوراس پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ ان کا مقصد ایک ایسا نظریہ تیار کرنا ہے جو مآخذ، اطلاق، قدیم نظریات کی شہادتوں، قانون اسلامی کے مکاتب فکر کے علمی ذخیرے، جدید تجدد پسندانہ تفسیر اور مابعد جدیدیت کے ذریعے پیش کردہ تنقید کے تجزیے پر مبنی ہو۔ ان مآخذ میں روایتی فقہ کا عظیم ورثہ، مصالح، عقلی دلائل اور حقوق کا جدید اعلامیہ نیز فقہ اسلامی کے معاصر نظریات میں جدید رجحانات کے نتائج شامل ہیں۔ عودہ طبیعی اور سماجی علوم کی شمولیت پر اصرار کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ان کے بغیر فقہ اسلامی فرسودہ رہے گی۔ پھر بھی ان کی بنیادی دلچسپی کائنات کے علم کی شمولیت میں نہیں، بلکہ خود اصول کے نظریے کی تنقید اور اصلاح ہے۔

حکم رانی اور پالیسی کے اسکالرز کو فقہ اور سیاسہ شرعیہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے چوں کہ ان کے بارے میں پہلے سے ہی معلوم ہے کہ وہ ایک مناسب مقصدی طرزِ فکر کی تشکیل اور اس کا اطلاق کریں گے۔ اس طرح کا طرزِ فکر اساسی اور عملی دونوں معاملات سمیت کسی بھی پالیسی کے شعبے میں مناسب ہدایات کو سمجھنے کے لیے ممکنہ طور پر تمام منزل اور غیر منزل علم کا سہارا لے سکتا ہے، جیسا کہ رمضان اور عودہ کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا ہدف ایک ایسا مقصد اور بامقصد منہج تیار کرنا ہے جو عوامی پالیسی میں معقول کردار ادا کر سکے۔ تمام منزل اور غیر منزل علم کا احاطہ کرنے کے لیے فقہ کی توسیع کے ذریعے پالیسی کا مقصدی طرزِ فکر بنیادی مآخذ سے مستنبط نکتہ حقیقت میں مطلوبہ ہدف تک پہنچانے کو یقینی بناتے ہوئے ایک فیصلہ ساز کی حدود کی توسیع کر سکتا ہے۔ اس ہدف کی کثیر الجہات نوعیت ان سطحی حدود کو مسترد کرنے کا تقاضا کرتی ہے، جنھوں نے اب تک فقہ کو شریعت کی جامع ترین تعریف سے حاصل ہونے والی تنقیدی مگر معتبر آگاہیوں کو اپنے اندر شامل کرنے سے روک رکھا ہے۔

آسمانی مآخذ سے مستنبط حکم رانی اور عوامی پالیسی کے جائزے پر کسی قابل ذکر، مربوط اور جدید کتاب کی عدم موجودگی کے سبب اسلام کے علمی ذخیرے میں حکم رانی کے حوالے سے ایک بڑی کمی پیدا ہوگئی ہے۔ بہترین انداز میں تیار کیے گئے ایک متبادل کی عدم موجودگی کی صورت میں

روایتی خیالات پیش کرنے والے علمائے مقاصد شریعت سے یہ تقاضا کیا جائے گا کہ وہ مطلوبہ علم یا احتساب کی ضروری حد کے بغیر عوام کے مجموعی مسائل کے لیے اس منہج کو موزوں بنائیں۔ اگرچہ یہ دقیانوسی مسائل کی غیر تنقیدی درآمد کے بالمقابل زیادہ قابل ترجیح ہے، تاہم یہ مطمح نظر (اپنی موجودہ صورت میں) عوامی پالیسی کا ایک مطمح نظر ہونے کی حیثیت سے بالکل مضبوط نہیں ہے اور یہ یقینی طور پر اسلام کی روح کا مکمل احاطہ نہیں کرتا ہے۔

شریعت کے ایک جدید جائزے کی ضرورت ہے: ایک ایسا جائزہ جس میں اقتدار کے رشتوں(Power Relations) اور دیگر انسانی ترجیحات، فیصلہ سازی کے ڈھانچوں، ریاست کے کرداراور احتساب، ہم آہنگی اور شفافیت، نیز آزادی اور حقوق کی نوعیت جیسے اقدار کی بہتر تفہیم کی کوشش کی جائے۔اس کی بنیاد لازماً ماضی وحال کے متعدد ممتاز علما کے ذریعے پہلے سے ہی حاصل کردہ مواد پر ہوگی، بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ بنیادی مآخذ کی علمی دولت پر انحصار کرے گا۔

باب پنجم

حقوق انسانی: حکم رانی کے مقاصد کا لازمی ڈھانچہ

شریعت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو کچھ پڑھایا گیا ہے اس کا بیش تر حصہ حقوق انسانی کے مسائل سے معقول بحث نہیں کرتا۔ یہ باب ان بڑے اسباب پر غور کرتا ہے کہ کیوں روایتی ادارے کو اس موضوع پر واضح رائے دینے یا ایک حقیقی طرزِ فکر پیش کرنے میں تأمل رہا ہے؛ یعنی ایک ایسی حقیقت جس نے خود کو عالمی حقوق انسانی کے وسائل کی ظاہری نقالی کے طور پر ظاہر کیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کی عوامی پالیسی کا مقصدی طرزِ فکر انسانی حقوق کو مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ مقاصد شریعت کے علما کی تصنیفات کو چار زمروں میں رکھا جا سکتا ہے: (۱) ارتقائی، (۲) بنیادی، (۳) مفاد پر مبنی اور (۴) اضافی۔ تاہم یہ سعی ایک حقیقی نظریہ پیش کرنے اور حقوق انسانی کو شریعت کے ایک بنیادی اور مستقل زمرے کے طور پر منظور کرنے کی ضرورت کو واضح نہیں کرتی ہے۔

مسلم اسکالرز کی توجہ حقوق انسانی سے متعلق ایک صحیح اور حقیقی علمی پروجیکٹ سے بالعموم ہٹا دی گئی ہے، اس کی وجہ مغرب کے غیر مذہبی نظام کے حوالے سے ان کا تصور ہے یا آمرانہ حکومتوں کے تحت بدلہ لیے جانے کا خوف۔ اس باب میں حقوق انسانی کو واضح طور پر فروغ دینے کے حوالے سے قابل ادراک تامل کی چار بنیادی وجوہات پیش کی گئی ہیں، جو اس طرح ہیں: حقوق انسانی کے خدائی بنام غیر مذہبی طرزِ فکر کا پہلو بہ پہلو ہونا اور یہ کہ کون صحیح معنوں میں ان میں سے کسی ایک کے تابع ہے، جدید اور 'بیرونی' اصطلاح کے استعمال میں تامل محسوس کردہ سماجی نتائج کی وجہ سے حقوق کے آزاد پسندانہ مغربی تصورات اور متعلقہ آزادی کی تردید، ایک ایسے سماجی نظام کے فروغ کا خوف جو آمرانہ ڈکٹیٹر شپ سے مزاحمت کرتی ہے جس میں علما اور فقہا رہتے ہیں۔

سیاسی دباؤ اور شاید حقوق انسانی کے عالمی نظام کے ساتھ ایک مشترک بنیاد قائم کرنے کی خواہش نے عالمی اعلامیہ برائے حقوق انسانی (Universl Declaration of Human Rights (1948) کے اسلامی نقطۂ نظر (ورژن) کی تخلیق اور منظوری کے لیے متنوع مساعی کی راہ ہموار کی۔ اس سلسلے کی دو اہم ترین بین الاقوامی دستاویز، جو اگرچہ واجب العمل نہیں ہیں، ۱۹۸۱ میں پیش کردہ عالمی اسلامی اعلامیہ برائے حقوق انسانی (Universal Islamic Declaration of Human Rights) اور ۱۹۹۰ میں پیش کردہ اسلام میں حقوق انسانی کا قاہرہ اعلامیہ (Cairo Declaration on Human Rights in Islam) ہیں۔ غیر مذہبی ورژن کی طرح اسلامی ورژن بھی زندگی، آزادی، مساوات، انصاف، منصفانہ مقدمہ، اذیت سے تحفظ، ریاستی امان، نیز عقیدے، اظہار، وابستگی، حرکت وغیرہ کی آزادی پر مشتمل ہے۔ ان پروجیکٹوں میں مشغول اسکالرز نے تصدیق کی ہے کہ ان وسائل کا بنیادی مآخذ شریعت ہے اور انھوں نے کچھ تحفظات کے لیے حوالے کا کام کیا ہے۔ تاہم اس طرح کے عمومی لفظوں کے ساتھ شریعت کا حوالہ دینے میں حقوق کو فروغ دینے کے بجائے ان کو محدود کرنے کی گنجائش زیادہ نظر آتی ہے۔

ایسا ہرگز معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اسلامی کردار نے اپنے غیر مذہبی ورژن کا اعتماد حاصل کیا ہے یا شریعت کی فطرت، لچک اور حرکیت کا احترام کیا ہے۔ تاریخ کے کسی بھی حصے میں انسانی مساعی سے نکلنے والا کوئی بھی وسیلہ اس کی تخلیق کرنے والی قوموں کی مخصوص تمناؤں، خوف اور ضروریات پر ردعمل کرتا ہے۔ عالمی اعلامیہ برائے حقوق انسانی یا حقوق انسانی کے کسی بھی بین الاقوامی قانون میں بکھرے ہوئے اسلامی تصورات کو سرایت کر کے اس کی نقالی نہ صرف غیر موثر رہی ہے، بلکہ اس نے اس میدان سے وابستگی رکھنے والے لوگوں کی توجہ صحیح اسلامی متبادل پیش کرنے کی راہ سے پھیر دیا ہے۔ عالمی اسلامی اعلامیہ برائے حقوق انسانی اور اسلام میں حقوق انسانی کے قاہرہ اعلامیہ کی بات کی جائے تو تخلیق کی کارروائیوں میں مذہبی تعصب اور سیاسی دباؤ نے اس طرح حقوق انسانی کی غلط تحدید کی راہ ہموار کی ہے کہ اس سے شریعت کی ثروت مندی اور اس کے

ذریعے انسانی ضروریات کی نمائندگی کی عکاسی نہیں ہوتی اور یہ چیز بالآخر ان کے آئندہ اعتبار و استناد کے فقدان کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

مقاصد شریعت سے متعلق علمی ذخیرے نے چار بنیادی طریقوں میں حقوق اور آزادی سے بحث کی ہے۔ پہلا طریقہ اس معنی میں بہت ناقص ہے کہ یہ مذہب یا ناموس کو مخصوص انسانی حقوق ثابت کرنے یا ان کو حقوق میں شامل کرنے کے لیے ان کے تحفظ کے مقاصد کو پیش کرنے کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ دوسرے طریقے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انسانی حقوق اہم اسلامی اصول کی بنیاد کی تشکیل کرتا ہے جن کو بنیادی حقوق اور آزادی کی پامالی کے ساتھ برقرار نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ اس تفہیم کا اصرار ہے کہ حقوق اور آزادی اگرچہ نصوص میں براہ راست مذکور نہیں ہیں، لیکن وہ واضح طور پر شریعت کے احکامات اور اصول میں مضمر ہیں۔ تیسرے طریقے میں تمام مقاصد کو لازمی حقوق کی حیثیت دے کر انسانی حقوق کے مفاد پر مبنی طرزِ فکر کو اختیار کیا جاتا ہے جس کے ذریعے تمام جدید تصورات کو مقاصد کی روایتی زمرہ بندی میں شامل کیا جاتا ہے۔ آخری اور چوتھے طریقے میں اس بات کی دلیل دی جاتی ہے کہ مقاصد کی بنیادوں میں حقوق اور آزادی سمیت اضافی جہات کو بھی شامل کرنا چاہیے۔

ایک حقیقی نظریہ کی ابتدا اس بات کے اعتراف کا تقاضا کرتی ہے کہ اسلام میں حقوق انسانی قرآن کے خدائی استناد سے اخذ ہوتے ہیں۔ اسلامی طرزِ فکر کی تشریح کے لیے دست یاب علم کو جزوی طور پر پہلے سے پیش کردہ تجزیوں میں پایا جا سکتا ہے، بطور خاص قرآن میں اخلاقیات کے متعلق، اور جزوی طور پر ان بنیادی متون میں جن کی لازمی طور پر چھان بین کی جانی چاہیے۔ مگر اس سعی کی ابتدا سے قبل ہی پالیسی تجزیہ کاروں کے لیے ایک اہم قرآنی تصور یعنی حدود کی بازیافت کرنا ضروری ہے۔ روایتی فقہ میں حدود کے نامناسب استعمال کے باوجود یہ تصور دراصل شریعت میں بنیادی حقوق کے ایک مستقل زمرے کے واضح بیان کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک حد دراصل ایک دائرہ ہے جس سے باہر نکل کر ایک فرد یا جماعت قانون خداوندی کو اور اس طرح زندگی کے توازن کو پامال کرتی ہے۔ حدود کا ذکر نو آیات قرآنی میں چودہ مرتبہ آیا ہے۔ ہر جگہ یہ واضح ہے کہ اس تصور کا مقصد انسانی اور بطور خاص نسوانی حقوق کو فروغ دینا ہے۔

عام معنوں میں انسانی حقوق کے قرآنی تصور کو سماجی فریضے کے ایک پیچیدہ نظام کے تحت اخلاقی اشیا کی رسد کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ قرآنی طرزِ فکر کا مقصد، خواہ افراد کے حوالے سے ہو یا معاشرے کی بڑی اکائیوں کے حوالے سے، اس بات کی ضمانت دینا ہے کہ حدود کم سے کم درجے میں قائم کی جائیں۔ حقوق انسانی کے سیکولر ماڈل کے برعکس، جو آزادی کو اہم ترین قدر قرار دیتا ہے، اسلام کا پیغام انسانی ناموس کی اہمیت پر زور دیتا ہے جو آزادی کو حقوق انسانی کے لیے لازمی مگر ناقص معاون کے طور پر قبول کرتا ہے۔ انسانی حقوق ہر مومن کے حق میں عمل کا ایک جواز فراہم کرتے ہیں، اور اس کا مقصد دیگر لوگوں کے ناموس کی حفاظت کرنا ہے جن کے ساتھ یا تو وہ راست محبت کا تعلق رکھتے ہیں، یا اپنے علم، وسائل اور لیاقت کی وجہ سے جن کو تعاون دینا ان کا فریضہ ہے۔ اسلامی طرزِ فکر کی بنیاد ایمان کے اخلاقی احکامات پر ہے، جن میں دنیا اور آخرت کی زندگی میں خدا کے سامنے جواب دہی کا یقین بھی شامل ہے۔ ایک ایسے قانون کا اہتمام جس کا اطلاق انفرادی طور پر ہر ذہن پر ہو سکے صرف اس مذہبی نظام کے اندر ہی ممکن ہوسکتا ہے جو خدا کی قدرت مطلقہ کے ساتھ اس بات کو بھی قبول کرتا ہے کہ خدا نے لوگوں کو زندگی میں جو نعمتیں عطا کی ہیں اس کے حساب سے وہ لوگوں کا فیصلہ کرنے کی غیر محدود اہلیت بھی رکھتا ہے۔ ریاستی اور قومی سطح پر حقوق کے اصول کا احاطہ کرنے کے لیے اس طرح کے اصول کی توسیع کی جاتی ہے۔

حقوق انسانی کے اسلامی نظریے کی اساس مذہبی اخلاقیات پر ہے اور اسے سیکولرزم پر مبنی حقوق انسانی کے بالمقابل ان بنیادوں پر زیادہ سوال کے دائرے میں نہیں لانا چاہیے۔ حقوق انسانی کے اس طرزِ فکر کے مطابق حقوق دینے والوں کے لیے ممکن ہے مسلمان ہونا ضروری ہو، مگر یہ بات حقوق حاصل کرنے والوں کے لیے یقیناً لازمی نہیں ہے۔ قرآن میں کوئی ایسی آیت یا سنت میں کوئی معتبر روایت موجود نہیں ہے جو اچھی اور اخلاقی چیزوں کی گنجائش کو صرف مسلمانوں تک محدود کردے۔ عقیدے کی آزادی یقیناً اسلام کا بنیادی نظریہ ہے اور یہ حقوق کی حصولیابی کے لیے کوئی شرط نہیں ہے۔ اسلام مسلمانوں کے لیے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ دوسروں کو بلا امتیاز مکمل حقوق فراہم کریں۔ شرعی نقطۂ نظر سے اخلاقی امور کی بے چون و چرا فراہمی کا مسئلہ طلب سے قطع نظر آفاقیت کا حامل ہے۔

باب ششم

اسلام میں حکم رانی اور عوامی پالیسی کی اخلاقیات

اسلام کی عوامی پالیسی ایک جامع اور مرکب اخلاقیات کے تابع ہے۔ شریعت ہمیں اس بات کے اعتراف پر مجبور کرتی ہے کہ فوائد ونقصانات کا تعین تنگ ذاتی مفادات یا ان معیاروں پر نہیں ہونا چاہیے جو اس کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے خلاف ہوں، بلکہ ممکنہ حد تک وسیع ترین بنیادوں پر ہونا چاہیے۔ توحید کا تصور (وحدت خداوندی اور سچائی، زمان مکان، تاریخ اور قضا وقدر کا تصور) اسلام کے نظام اخلاقیات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ یہ تمام مخلوقات اور خالق ومخلوق کے درمیان پیچیدہ رشتوں کو محیط ہے۔ ہر چند کہ مقاصد شریعت سے سروکار رکھنے والے علما نے فوائد ونقصانات کے مسائل سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم شریعت کی وسعت اور گہرائی کے برخلاف ان کے کارناموں کو ایک موضوع کی حدود کے ذریعے محدود کر دیا گیا ہے۔ نتیجے کے طور پر اس طرح کے کارناموں کی اخلاقی وسعت کو عمومی طور پر مسلمانوں، بلکہ مخصوص جغرافیائی مقام کے اندر رہنے والے مسلمانوں تک سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں امت کے تصور پر نظر ثانی کرنا اہم ہے جس کو بہت سے علما فوائد ونقصانات سے بحث کرتے ہوئے سب سے عام حوالے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ عمومی تفہیم کے برعکس امت کے تصور کا اطلاق صرف شریعت کے حدود میں رہنے والے مسلمانوں تک محدود نہیں، بلکہ بہت وسیع ہے۔ بلکہ عوامی پالیسی اور حکم رانی کی اسلامی اخلاقیات کو یقیناً انسان مرکوز نقطۂ نظر سے ماورا ہونا چاہیے جو آج تک فقہ اسلامی کے بیش تر حصے کی خصوصیت رہی ہے۔

اخلاقیات کی اس بحث میں حکمت کا آغاز توحید کے فلسفیانہ اصول سے ہوتا ہے۔

فلسفۂ شریعت میں توحید ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کا یہ حکم کہ، جوڑی جانے والی چیزوں کو توڑنا نہیں چاہیے (سورہ البقرہ: ۲۷، الرعد: ۲۵) توحید کی وسعت، گہرائی اور پیچیدگی کو بیان کرتا ہے۔ یہ وہ اخلاقی اصول ہے جو حکم رانی اور پالیسی کو ایک غیر یقینی کیفیت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اس کا حل صرف بنیادی مآخذ میں موجود عملی اخلاقیات کے ذریعے پیش کیا جا سکتا ہے، جسے لازمی طور پر ہر عہد کے ایمان دار اور منزل و غیر منزل متن میں پختہ تربیت کے حامل علما کے ذریعے کھنگالا اور بیان کیا جانا چاہیے۔ تاہم یہ بہت دشوار عمل ہے، کیوں کہ تمام مخلوقات کے درمیان روابط تو دور کی بات، ان کے باہمی انحصار، پیچیدگی اور حد کا احاطہ کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے علمی نقص کو ایمان اور ان اصولوں کے تابع ہونا چاہیے جنھیں حکمت خداوندی نے انسان کو نقصان کی مقدار کم کرنے کے قابل بنانے کی غرض سے قائم کیے۔

اس کے بعد فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں حکم رانی اور پالیسی کے لیے توحید کے اصول اور عمل کا مفہوم کیا ہے۔ تو پہلے اس بات کو ثابت کیا جائے کہ اس کا مفہوم کیا نہیں ہے۔ اس کا مفہوم ایک عالمی خلافت نہیں ہے۔ اس غیر معمولی دعوے کی حمایت کے لیے قرآن وسنت یا قدیم اسلامی حکومت میں اس کا کہیں بھی واضح یا مبہم ذکر نہیں ملتا ہے۔ توحید کا ایک بنیادی مقصد دراصل اس کثرت کا اعتراف اور احترام ہے جو اس متحدہ اور بامقصد وحدت کی تشکیل کرتا ہے۔ نظام ہائے حکم رانی پر بھی یہ بات اسی قدر صادق آتی ہے جو دنیا بھر کی مختلف سیاسی اکائیوں کی زندگیوں کی تشکیل کرتی اور ان میں رنگ بھرتی ہیں۔ فوائد ونقصانات کے مناسب تعین میں خود تعینی کے اصول کو لازمی طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔

مقاصد شریعت سے متعلق روایتی ذخیرۂ علم میں فوائد ونقصانات کے مسئلے کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ روایتی علما نے عمومی طور پر مقاصد کے اطلاق کو فوائد کے حصول اور نقصانات کی روک تھام کے طور پر پیش کیا ہے۔ چناں چہ فوائد کے حصول کے لیے فیصلے اس طرح کیے جانے چاہییں کہ اس سے مذہب، زندگی، دماغ، اولاد، دولت اور ناموس کے تحفظ کو فروغ ملے۔ اپنی ماہیت کے اعتبار سے یہ چھ مقاصد عوامی مفاد کے مترادف ہیں اور مختلف طریقوں اور وسائل سے ان مقاصد کی

جستجو کو سیاستِ شرعیہ یا شریعہ مرکوز سیاست کہتے ہیں۔ عملی طور پر کسی عوامی مسئلے کے لیے صرف فائدے پر مبنی حل کو پالینا اسی طرح شاذ و نادر ہوتا ہے جس طرح خالصتاً نقصان دہ متبادل (ضرر خالص) کا نفاذ شاذ و نادر ہوتا ہے۔ بیش تر پالیسی متبادل کا وقوع ان کے درمیان میں کسی جگہ ہوتا ہے اور ان میں واضح امتیاز ممکن نہیں ہوسکتا ہے۔ چناں چہ فقہا نے فوائد و نقصانات کے درمیان توازن قائم کرنے کے طریقے پیش کیے ہیں۔ تاہم وہ بالعموم ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ پالیسی اور حکم رانی سے متعلق فیصلوں کے لیے مناسب حدود کیسے قائم کی جائیں۔ اس کے لیے ہمیں امت کے تصور کا جائزہ لینا چاہیے۔

فوائد و نقصانات کے تعین سے قبل اس بات کا تعین ضروری ہے کہ کس کے فوائد و نقصانات اہمیت رکھتے ہیں۔ فلسفۂ توحید اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ تمام زندگیوں کو تقدس کی نظر سے دیکھا جائے جس سے اس بات کا تعین خاصا دشوار ہو جاتا ہے کہ کس کے فوائد اہمیت رکھتے ہیں اور کس کے نہیں۔ مزید براں یہ کہ کیا اسلام میں حکم رانی اور عوامی پالیسی صرف انسانوں پر غور کرتی ہے؟ کون سے انسانوں پر؟ یا وسیع تر مسائل کی بھی کوئی بنیاد ہے؟ کیا شریعت صرف موجودہ نسلوں کو مخاطب کرتی ہے یا مستقبل کی نسلوں سے متعلق اخلاقی جہات بھی موجود ہیں؟ کون اندر ہے اور کون باہر، اس کا تعین تصورِ امت کی ہماری تفہیم سے متعلق ہے۔ عمومی معنی میں امت ایک قوم ہے۔ یہ اکثر و بیش تر خالصتاً ماضی، حال اور مستقبل کی عالمی مسلم قوم کا حوالے دینے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ تاہم بہت سے علما اور فقہا اپنے اقوال کو کسی خاص جغرافیائی علاقے کے مسلمانوں تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ بات مذہبی قانون کے اطلاق کے لیے تو مناسب ہوسکتی ہے، مگر یہ حکم رانی کے لیے اطمینان بخش نہیں ہے، جہاں صرف تنوع کا غلبہ نہیں ہوتا، بلکہ وہاں بنیادی دل چسپی عوامی مفاد سے ہوتی ہے۔ شریعت تین دیگر اہم تفہیمات کی طرف اشارہ کر کے اس مسئلے کا حل پیش کرتی ہے۔ اولاً امت مسلمہ یعنی تمام مسلمانوں سے متعلق ہے۔ ثانیاً ان اقوام سے متعلق ہے جو سیاسی اور جغرافیائی لحاظ سے مربوط ہیں اور عقیدے سے قطع نظر اقدار و ضروریات میں مشترک ہیں۔ اور ثالثاً دیگر زندہ مخلوقات کے حوالے سے اس تصور کے استعمال سے متعلق ہے۔

قرآن میں واضح کردہ اخلاقی نظام جامع ہے اوراس وجہ سے وہ خدا کی تمام مخلوقات کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ لوگوں کو تمام مخلوقات کی روحانی جہت کے متعلق سوچنے پر آمادہ کرتا ہے، چناں چہ تمام مخلوقات اگر احترام کے لائق نہ بھی ہوں تو تحفظ وتقدس کے لائق ضرور ہیں۔قرآن اس سلسلے میں اٹل ہے اور اولادِ آدم کو وقار بخشتے ہوئے ان کو زندگی کے عظیم الشان جال کے درمیان میں رکھتا ہے۔صرف بطور مسلمان ہی نہیں، بلکہ انسان ہونے کی حیثیت سے ہمارے اندر اس نکتے کو قبول کرنے کی اہلیت مفقود ہونے کی وجہ سے ہمارے اجتماعی مستقبل کے لیے ایک تنگ نظر اور خطرناک تخیل کا راستہ ہموار ہوا ہے۔

انسانیت انسانوں کے علاوہ بھی بہت ساری چیزوں کا تقاضا کرتی ہے۔اس سلسلے میں فقہ کے ایک بڑے حصے کی سطحیت نے اخلاقی معاملات کو وسیع اور پیچیدہ تر عوامی مسائل کے لیے غیر اہم بنا دیا ہے، اس سطحیت کی وجہ لازمی طور پر فقہا اور علما کے ذہن کی سطحیت نہیں بلکہ مذہبی تحقیق میں فقہاء کے ذریعے اپنایا جانے والا پہلے سے طے شدہ طرزِ فکر ہے۔اس رویے نے متبادل نقطہ ہائے نظر اور قرآن میں موجود ان بیانات کی جستجو سے صرف نظر کیا ہے جو ہمارے اجتماعی وجود کی ترقی کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔مقاصد شریعت کا علمی ذخیرہ اس مصیبت کا حل پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے، مگر یہ مقبول عام فقہی رجحان کے لیے خارجی چیز کی ہی حیثیت رکھتا ہے۔گرچہ یہ ایک جرأت مندانہ موقف اختیار کرتا ہے، لیکن یہ جامع اخلاقیات کی مکمل حدود کا جائزہ لینے اور اعتماد کے ساتھ اس کے نتائج کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے سلسلے میں متامل ہے۔

باب ہفتم

اسلام کی عوامی پالیسی

تجدید واصلاح کے ایک عمل کی حیثیت سے

اس باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شریعت اپنے آغاز سے ہی سماجی انصاف کے حصول کے لیے کوشاں رہی ہے، جس کا مطلب کسی معاشرے میں انسانی وقار کے بنیادی اصول کے مطابق مواقع، دولت اور مراعات کی مساوی تقسیم ہے۔ یہ قرآن میں تقویٰ اور طاقت کے درمیان رشتے کی بحث سے شروع ہوتا ہے، جس کا مقصد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ دونوں کے درمیان کا فرق قرآنی اخلاقیات کے تعارف اور اطلاق کو ایک اجتماعی ذمہ داری قرار دیتا ہے اور اس کے لیے اسلامی سیاسی قیادت یا ریاست شرط نہیں ہے۔ عرب میں اسلام کے تعارف کی تاریخ سماجی اصلاح کے ایک جامع عمل کی نوعیت اور اس کے مراحل کی تفصیلات پیش کرتی ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں مسلم اقتدار کے غلبے کو بذات خود ایک انجام، اور اس کی وجہ سے ریاست کے لیے ایک غیر مشروط محرک نہیں، بلکہ علاقائی رعایا کے لیے اسلام کی ایک اپیل اور وقت کی سماجی مشکلات کو حل کرنے میں اس کی افادیت کا ایک نتیجہ سمجھا جائے گا۔ اس پیغام کے اولین مخاطب نے سمجھا کہ دین کا بڑا حصہ موجودہ حالات کی وجہ سے حصول انصاف کے مقصد سے شریعت کا وقتی بیان واظہار ہے۔

قرآن کے مطالعے کے بعد جو چونکا دینے والا نتیجہ سامنے آتا ہے وہ سیاسی قوت اور تقویٰ یا زیادہ عام تعبیر میں اخلاقی رویے کے درمیان واضح تفریق ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے طاقت عطا

کرتا ہے، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، صاحب ثروت ہو یا نادار، اچھا ہو یا برا، مومن ہو یا باغی اور علاقائی ہو یا بیرونی۔ یہ اسلام میں حکم رانی، عوامی پالیسی اور عوامی سرگرمی کے لیے اہم مضمرات رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شریعت میں پیش کردہ ہدایت کے ماہر عاملین خود نظام حکم رانی میں یا عوامی سماج میں پائے جا سکتے ہیں۔ عاملین کا مقام ہی ان کی ذمہ داری کی حد، نوعیت اور ممکنہ طریقۂ کار کو واضح کرتا ہے۔ تقوی اور طاقت کے مابین یہ تفریق ان اداروں کے قیام کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتی ہے جو حکومت اور اس کے قائدین کی مبینہ مذہبی وابستگی سے قطع نظر غیر اخلاقی رویے کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دین کا تحفظ (جیسے دین اسلام) تمام چھ بنیادی مقاصد میں اہم ترین مقصد ہے۔ شریعت کے دیگر تمام مقاصد اپنی قدیم تعریف کی رو سے تاریخ کے کسی بھی دور میں اس اعلیٰ ترین مقصد کے دائرے میں آ جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر زندگی، اولاد، دماغ، ناموس اور دولت سب کے تحفظ کی تشریح اور تنظیم دین کے مروجہ تصور سے ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماجی اصلاح اور ناانصافی کا مداوا راست طور پر دین کی ہماری تفہیم اور اس پر عمل سے وابستہ ہے۔

عام مفہوم کے لحاظ سے اسلام عبادات، عقیدہ اور معاملات سے مرکب ہے۔ چناں چہ دین کا تحفظ دو بنیادی اعمال پر مشتمل ہے۔ اولاً عبادت کے بنیادی اعمال نیز فتنوں اور بدعات کے خلاف جن چیزوں پر ان کا انحصار ہے، ان کی حفاظت کرنا۔ اس بات کی شہادت کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، نماز ادا کرنا، روزہ رکھنا، زکاۃ کی ادائیگی اور حج کم وبیش ہمیشہ کے لیے ناقابل ترمیم رہیں گے۔ ثانیاً متعلقہ قواعد کو پیش آمدہ حالات کے ساتھ جوڑ کر اور ان کو اپنی داخلیت کا حصہ بنا کر قرآن میں بیان کردہ فرائض کو عملی جامہ پہنانا ہے، تاکہ رحم دلی، مساوات، انصاف، حکمت اور انفرادی، قومی اور ملکی سطح پر فلاح جیسے اسلام کے بنیادی اقدار کے ذریعے ہمارے اعمال کی تشریح ہو سکے۔

اس جد وجہد کی حمایت کے لیے مطلوب ہدایت تجدید دین کے حکم میں موجود ہے جس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس انتباہ میں اشارہ فرمایا کہ قیامت کے دن لوگوں کو

جواب دینا ہوگا کہ انھوں نے اپنی زندگی کن مشاغل میں بسر کی، کن مقاصد کے لیے کام کیا، کن ذرائع سے دولت کمائی، اپنے وسائل کا استعمال کیسے کیا اور خود اپنے جسم کا استعمال کس طرح کیا۔ (سنن ترمذی، کتاب صفات القیامہ، باب اول)۔ تمام اہم تاریخی ادوار کے لیے اسلام کی وسیع و گہری جہات کو مناسب اور لچک دار سماجی عمل میں اتارنے کی اپنی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری معاصر دنیا میں یہ ایک جدید فقہ یعنی 'فقہ واقعی' یا عملی فقہ کا تقاضا کرتا ہے۔ منزل متن اور اس کی تاریخی اہمیت کے علم کو زیادہ سے زیادہ فقہ نثری یا ایک نظریاتی تفہیم قرار دیا جاسکتا ہے، جن پر آج کے فقہا اور علما کے ذریعے بیان کردہ چیزوں کا بیش تر حصہ مشتمل ہے۔ اسی طرح احساساتی اور تجرباتی دنیا سے باخبر ہونے کو بہترین تعبیر میں حقیقت کی تفہیم یا فقہ واقعی قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاہم اصلاح وتجدید ان دونوں کو ہم آہنگ کرنے کا تقاضا کرتی ہے جو فقہ واقعی یا حقیقت پسندانہ اور عملی تفہیم کو فروغ دیتا ہے، اور اس سے مختلف تناظر میں مناسب اطلاقات کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

اسلام کی اولین تاریخ اس بات کی دل خراش مثال ہے کہ کس طرح سے نوزائیدہ امت مسلمہ نے یہ عظیم کامیابی حاصل کی، اور نتیجے کے طور پر وہ ایک ایسے سیاسی نظام کو تبدیل کرنے کے قابل ہوئی جس نے بہت سی دیگر ناانصافیوں کے علاوہ مخصوص افراد اور گروہوں کو محروم و مظلوم بنا رکھا تھا۔ اس اولین تاریخ سے جو اسباق سیکھے جاسکتے ہیں ان میں چند مندرجہ ذیل ہیں: (۱) ایک ایسے پیغام کی اہمیت جو سچا، واضح، معقول اور مفید ہو، (۲) ایک ایسی قیادت جو اہل، مضبوط اور پرعزم ہو، مگر آمریت پسند نہ ہو، (۳) عوام الناس، چاہے اشراف ہوں یا نااہل، کے ممکنہ کارناموں کی تخفیف سے احتیاط، (۴) معاشی معاملات اور دباؤ کے اثر پر کڑی توجہ، (۵) امن کی ترجیح اور تکثیریت کا احترام، (۶) مسلح دفاع کو صرف آخری اور محدود ترین چارۂ کار کے طور پر قبول کرنا۔

اسلام کی عوامی پالیسی بنیادی طور پر اصلاح وتجدید کی ایک سعی ہے۔ خدائی اسکیم میں سیاسی قوت اور تقویٰ کی تفریق کا مقصد ایسے افراد اور گروہوں کے ظہور کی حوصلہ افزائی کرنا ہے جو مفید چیزوں کی تجویز اور دفاع اور نقصان دہ چیزوں کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اس حقیقت کی

شدت کو کم کرنے والے اداروں کے قیام کی ضرورت کے حوالے سے بھی بیداری پیدا کرتا ہے۔ اسلام عقیدے اور عمل کا مذہب ہے۔ ہر گز رتی صدی معیاری افراد اور گروہوں کا تقاضا کرتی ہے جو معاصر حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے منزل متن کی تفسیر کرنے کا جوکھم اٹھانے کی طاقت اور علم رکھتے ہوں۔ دین کی اس تجدید کے ذریعے پیش کردہ ہدایت کا مقصد لوگوں کو اپنے زمان و مکان کی مشکلات سے کامیابی کے ساتھ نمٹنے میں مدد کرنا ہے۔ اسلام کی اولین تاریخ اس سلسلے میں بہت مفید ہے۔ ایک نئے پیغام کو اس کی جامع سماجی، معاشی اور سیاسی اصلاحات کے ساتھ قبول کرنے کی وجہ سے نئے تناظر کی راہ ہموار ہوئی ہے۔

مصنفِ کتاب

بسمہ آئی عبد الغفار مقاصد انسٹی ٹیوٹ کی نائب صدر اور عوامی پالیسی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ پالیسی، حکم رانی اور مسلم امور کے حوالے سے وہ بین الاقوامی مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ قطر فاونڈیشن میں اسلام کی عوامی پالیسی میں ماسٹرس پروگرام کی بانی ذمہ دار تھیں، کناڈا کی وفاقی حکومت میں پالیسی سے متعلق مختلف عہدوں پر فائز رہ چکی ہیں، نیز کناڈا، امریکا، سنگاپور، ملیشیا، ترکی، مصر اور جنوبی افریقا کے تعلیمی اداروں میں اسلامی حکم رانی کے موضوع پر لیکچرس دے چکی ہیں۔

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کی مختصر کتابوں کا سلسلہ ادارے کی اہم اشاعتوں کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے، جنھیں خلاصے کی شکل میں اس لیے تحریر کیا گیا ہے کہ قارئین کو اصل کتاب کے اہم مضامین کے بارے میں بنیادی واقفیت ہو جائے۔

عوامی پالیسی کے شعبے پر مقصدی نقطۂ نظر سے بحث کی کوشش کے ذریعے زیر نظر کتاب اسلام کے علمی ذخیرے میں ایک نئے باب کی تشکیل کرتی ہے۔ عوامی پالیسی دراصل قانون اور سیاست دونوں سے علاحدہ ایک مستقل شعبۂ علم ہے۔ چنانچہ یہاں اسلام کی عوامی پالیسی کو خصوصیات کے لحاظ سے فقہ اور سیاستِ شرعیہ سے ایک جداگانہ موضوع کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔

یہ کتاب متعدد اہم موضوعات سے بحث کرتی ہے جن میں منہج، حکمرانی، حقوق انسانی، اخلاقیات، سیاسی قوت اور اصلاح وتجدید شامل ہیں۔ یہ کتاب اس بات کو نمایاں طور پر پیش کرتی ہے کہ طرزِ فکر کس طرح اسلام کی عوامی پالیسی کے عمل ونظریے کے لیے ناگزیر ہے، نیز مسلم حکم رانی کی پوری تاریخ میں مسلسل پیش آنے والے اضطرابی حالات کو طرزِ فکر کے ذریعے کس طرح حل کیا جا سکتا تھا، مگر اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اسلام کی عوامی پالیسی کو مروجہ پالیسی مطالعات میں متعارف کرانے کے لیے مقصدی طرزِ فکر بنیادی مآخذ میں موجود علمی اثاثے کی جدید تصور سازی پر کس طرح زور دیتا ہے۔

Al-Ittehad Publications Pvt. Ltd

Al Ittehad Publication Pvt. Ltd.
B-35 (LGF), Nizamuddin West, New Delhi-110013
Ph.: +91-11-41827475, 9315177399
e-mail.: alittehad@gmail.com

978-93-80946-51-1

9 789380 946511